مسلم پرسنل لاء

اور بعض غلط فہمیاں

مولانا خالد سیف اللہ رحمانی

المعہد العالی الاسلامی، حیدر آباد

فہرست مضامین

☆☆☆

پیش لفظ

اللہ تعالی نے انسان کو جن نعمتوں سے نوازا ہے، ان میں اہم ترین نعمت اس کی طرف سے نازل کی جانے والی شریعت ہے، جس میں انسان کے لئے دنیا کی بھلائی بھی ہے اور آخرت کی کامیابی بھی، کیونکہ شریعت میں جتنے احکام دیئے گئے ہیں، وہ سب انسان کے نفع کے لئے ہیں، پھر شریعت میں جہاں اللہ تعالی کی عبادت کا طریقہ سکھایا گیا ہے، وہیں اس بات کی بھی رہنمائی فرمائی گئی ہے کہ ایک انسان دوسرے انسان کے ساتھ کس طرح پیش آئے؟ شوہر و بیوی کا ایک دوسرے کے ساتھ کیسا تعلق ہو؟ والدین اور اولاد کے ایک دوسرے پر کیا حقوق ہیں؟ ترکے کی تقسیم کس طرح ہو؟ یہ، اور خاندانی زندگی سے متعلق اس طرح کے دوسرے قوانین کو ہمارے ملک کی اصطلاح میں ''مسلم پرسنل لاء'' کہا جاتا ہے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ شریعت کے یہ احکام بھی پوری طرح انسانی فطرت سے ہم آہنگ ہیں؛ اسی لئے تقریبا تمام ہی قوموں نے اسلامی شریعت سے استفادہ کیا ہے؛ مگر افسوس کہ بعض لوگ اپنی ناواقفیت کی وجہ سے شریعت کے ان مفید قوانین کے متعلق غلط فہمی میں مبتلا ہیں. یا ان پر اعتراض کرتے ہیں، حالانکہ اگر وہ گہرائی کے ساتھ غور کریں تو محسوس کریں گے کہ یہ احکام پوری طرح انسانی ضرورت اور مصلحت کے مطابق اور خاندانی نظام کے استحکام کا ذریعہ ہیں، اس طرح کی بعض غلط فہمیاں نہ صرف برادران وطن میں

ہیں؛ بلکہ بعض ان جدید تعلیم یافتہ مسلمانوں میں بھی ہیں، جنہوں نے باضابطہ طور پر علم دین حاصل نہیں کیا ہے اور شریعت کے معاملہ میں جن کا مطالعہ ناقص اور سطحی ہے۔

اس کو سامنے رکھتے ہوئے آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ نے ''تفہیم شریعت'' کا شعبہ قائم کیا ہے؛ تاکہ قانون داں اور دانشور حضرات کو اسلام کے عائلی قوانین کے بارے میں صحیح معلومات فراہم کی جائے اور ان کی غلط فہمیوں کو بھی دور کیا جائے، بحمد اللہ یہ بورڈ کے فعال شعبوں میں ہے اور اس سے لوگوں کو بڑا فائدہ ہو رہا ہے، ملک کے بہت سے شہروں میں اس کا پروگرام منعقد ہو چکا ہے اور راقم الحروف کو بھی اس کے بعض پروگرام میں شرکت کا موقع ملا ہے۔

اس کمیٹی کے موجودہ کنوینر عزیز مکرم جناب مولانا خالد سیف اللہ رحمانی سلمہ اللہ تعالی، جن کو اللہ تعالی نے فقہی بصیرت بھی عطا کی ہے اور وہ احکام شریعت کی مصلحتوں اور حکمتوں کو بھی خوش اسلوبی کے ساتھ پیش کرنے کا سلیقہ رکھتے ہیں، انہوں نے تفہیم شریعت کے نقطہ نظر سے یہ کتاب '' مسلم پرسنل لا اور بعض غلط فہمیاں'' مرتب کی ہے، جو اس مقصد کے لئے بڑی مفید ہے، اس میں قریب قریب ان تمام ہی موضوعات پر گفتگو کی گئی ہے، جن کے بارے میں غلط فہمی پیدا کی جاتی ہے اور ہر بات حوالہ کے ساتھ اور آسان زبان میں لکھی گئی ہے۔

اس مفید کوشش پر خوشی کا اظہار کرتا ہوں اور امید کرتا ہوں کہ اہل علم اس سے فائدہ اٹھائیں گے۔

(حضرت مولانا) سید محمد رابع حسن ندوی ۲۰ ؍ربیع الثانی ۱۴۳۸ھ

(صدر آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ) ۲۱ ؍جنوری ۲۰۱۷ء

ابتدائیہ

شریعت کے احکام پر عمل کرنے سے نہ صرف آخرت کی نجات متعلق ہے؛ بلکہ اسی پر دنیا میں بھی انسانیت کی فلاح و بہبود اور زندگی کا اطمینان وسکون موقوف ہے، اس کی ایک واضح مثال شریعت کے وہ قوانین ہیں جو عائلی زندگی سے متعلق ہیں، مختلف قوموں اور ملکوں میں جب بھی ان احکام کو نظر انداز کیا گیا، وہاں اخلاقی بحران پیدا ہوا اور معاشرہ امن وسکون سے محروم ہو گیا؛ چنانچہ بہت سے قوانین وہ ہیں جن میں مغرب و مشرق کو شریعت اسلامی سے خوشہ چینی کے سوا کوئی چارہ نہیں رہا، مثلاً دنیا کے دو بڑے مذاہب ہندومت اور عیسائیت میں طلاق کا تصور نہیں تھا؛ لیکن ہندو اور عیسائی سماج کو اس کو قبول کرنا پڑا، اسی طرح اسلام کے سوال کسی مذہب میں عورتوں کو میراث میں حق نہیں دیا جاتا تھا؛ لیکن آج تمام قومیں اس بات کو تسلیم کرتی ہیں کہ عورت کو حق میراث سے محروم نہیں رکھا جا سکتا، پس یہ ایک حقیقت ہے کہ زندگی کے دوسرے شعبوں سے متعلق شرعی قوانین کی طرح اسلام کے عائلی قوانین (مسلم پرسنل لا) بھی انسانی فطرت سے حد درجہ ہم آہنگ اور سماجی ضرورتوں اور مصلحتوں سے پوری طرح مطابقت رکھنے والے ہیں، مگر افسوس کہ جو لوگ آزادی اور ترقی کے نام پر عورتوں کی عزت و ناموس کا سودا کر رہے ہیں، ان کی طرف سے ''الٹے چور کوتوال کو ڈانٹے'' کے مصداق شریعت اسلامی کے بعض احکام کو نامنصفانہ اور عورت مخالف قرار دیا جاتا ہے۔

مغربی دنیا نے اس جھوٹ کو اس قدر تکرار کے ساتھ بیان کیا ہے کہ وہ لوگ بھی اس سے متأثر ہو گئے ہیں، جنہوں نے مستشرقین اور مغربی مصنفین کے ذریعہ اسلامی قانون کو سمجھا ہے، ایسے ہی لوگوں میں وہ حضرات بھی شامل ہیں جو ہمارے ملک میں عدل و انصاف کی کرسی پر بیٹھے ہیں اور شاید ان کو اس سلسلہ میں قصوروار قرار دینا بھی مناسب نہ ہو؛ اس لئے کہ انسان جو کچھ پڑھتا اور لکھتا ہے، اسی کو سچ سمجھتا ہے اور اسی کے مطابق اس کی سوچ بنتی ہے، افسوس کہ یہ صورت حال نہ صرف غیر مسلم قانون دانوں کی ہے؛ بلکہ مسلمان وکلاء، ججز اور دانشوروں کا معاملہ بھی کچھ بہت مختلف نہیں ہے؛ کیونکہ ان حضرات نے بھی اسلام کو کتاب وسنت اور فقہاء اسلام کی کتابوں سے نہیں سمجھا ہے: بلکہ ان کی معلومات بھی بالواسطہ ہیں، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ جب ان کے سامنے اس طرح کے مسائل آتے ہیں تو ان کے لئے معذرت خواہانہ انداز اختیار کرنے کے سوا چارہ نہیں ہوتا۔

اس ناواقفیت کے دو پہلو ہیں: ایک شریعت کے احکام سے ناآگہی، مثلاً: بہت سے وکلاء یہ سمجھتے ہیں کہ اگر کوئی شخص اپنی اولاد کے عاق کئے جانے کا اعلان کر دے تو وہ آئندہ حق وراثت سے محروم ہو جاتا ہے، یا بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اگر کوئی شخص اپنی بیوی کو طلاق دینا چاہے تو تین بات طلاق کہنا چاہئے، جب ہی اس کی بیوی پر طلاق واقع ہوگی، اسی طرح قرآن مجید نے زوجین کے درمیان پیدا ہونے والی کسی بھی قسم کی نزاع کو دور کرنے کے لئے حکم دیا ہے کہ اگر آپس میں مسئلہ کو حل نہ کر سکیں تو درمیان میں حَکَم رکھ کر صلح کی کوشش کریں، اس ہدایت کا طلاق سے کوئی تعلق نہیں اور نہ قرآن مجید نے طلاق کے سیاق وسباق میں اس کا ذکر کیا ہے: لیکن بعض ججز نے اس مسئلہ کو کچھ اس طرح سمجھا کہ یہ طلاق سے متعلق ہے اور گویا طلاق واقع ہی اس وقت ہوگی، جب زوجین کے درمیان حَکَم

کے ذریعہ صلح کی کوشش کی جاچکی ہو، اور ثمر آور نہ ہوئی ہو، ظاہر ہے کہ سب باتیں ناواقفیت اور ناآگہی پر مبنی ہیں۔

دوسرا پہلو یہ ہے کہ بعض احکام شرعیہ سے وہ واقف تو ہیں: لیکن ان احکام کے پس منظر سے واقف نہیں ہیں، اور ان کی مصلحتوں پر ان کی نظر نہیں ہے، جیسے بعض حالات میں عورتوں کا حق میراث مردوں کے مقابلہ میں کم ہے؛ لیکن یہ اس لئے ہے کہ شریعت نے تمام مالی ذمہ داریاں مرد پر رکھی ہیں، عورتوں کو اس سے فارغ رکھا ہے، یا جیسے اسلام نے ایک سے زیادہ نکاح کی عدل وانصاف کی شرط کے ساتھ اجازت دی ہے، اس کو خلاف عدل سمجھا جاتا ہے؛ حالانکہ یہ اکثر حالات میں خود عورتوں کے لئے باعث رحمت ہوتا ہے اور اخلاقی اقدار کے تحفظ ہیں، اس کا بڑا اہم رول ہے، جن قوموں نے قانونی تعدد ازدواج پر پابندی عائد کی ہے، وہ غیر قانونی تعدد ازدواج کے سیلاب کو روکنے میں بری طرح ناکام رہی ہیں، ضرورت اس بات کی ہے کہ شریعت کے احکام صحیح طور پر لوگوں تک پہنچائیں جائیں اور ان کی مصالح اور حکمتیں واضح کی جائیں۔

اسی پس منظر میں آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ نے اجلاس بھوپال ۲۰۰۵ء میں ''تفہیم شریعت کمیٹی'' قائم کی ہے، جس کا بنیادی مقصد مسلم پرسنل لا کے سلسلہ میں غلط فہمیوں کو دور کرنا، احکام شرعیہ سے قانون دانوں کو واقف کرانا اور اسلامی تعلیمات کی مصلحتوں کو واضح کرنا ہے، بورڈ اس سلسلے میں مختلف لٹریچر شائع کرتا رہا ہے، یہ بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے، جو دراصل مختلف تحریروں کا مجموعہ ہے، ان میں سے اکثر تحریریں وہ ہیں جو مختلف مواقع کی مناسبت سے لکھی گئی ہیں، اور اخبارات میں شائع بھی ہوچکی ہیں، یا بورڈ کی طرف سے عدالت میں پیروی کرنے والے معزز وکلاء کی خواہش پر اس حقیر نے

مرتب کی ہیں؛ لیکن اب جب کہ ان تحریروں کے مجموعہ کو کتابی شکل دی جارہی ہے، اس میں ترمیم واضافہ بھی کیا گیا ہے، اور بعض عبارتیں حذف بھی کی گئی ہیں، نیز بعض کتابوں اور ویب سائٹوں کی مدد سے اعداد وشمار کا بھی ذکر کردیا گیا ہے؛ تاکہ صحیح صورت حال کو سمجھنے میں آسانی ہو۔

اس کتاب کی ترتیب کا محرک یہ ہوا کہ جناب ظفریاب جیلانی ایڈوکیٹ سیکریٹری بورڈ کے کالج میں تفہیم شریعت کمیٹی اتر پردیش کی افتتاحی تقریب منعقد ہوئی، صدر بورڈ حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی صاحب نے صدارت فرمائی اور اس حقیر نے تفہیم شریعت کے تحت آنے والے بعض مسائل پر گفتگو کی، صدر محترم نے اس پر پسندیدگی کا اظہار فرمایا اور مجھ سے کہا کہ اس کو تحریری شکل میں بھی آنا چاہئے، اس لئے نہ صرف ایک ضرورت کی تکمیل ہے، بلکہ راقم الحروف کے لئے اپنے بزرگ کی تعمیل حکم وسعادت بھی ہے۔

یہ مجموعہ پہلی بار المعہد العالی الاسلامی میں منعقد ہونے والے تفہیم شریعت ورکشاپ فروری ۲۰۱۴ء کے موقع سے تفہیم شریعت کمیٹی برائے خواتین تلنگانہ وآندھرا پردیش نے شائع کی تھی اور کمیٹی کے کنوینر محترمہ جلیسہ یاسین صاحبہ کی خصوص محنت شامل تھی، اللہ تعالی ان کو بہتر سے بہتر اجر عطا فرمائے، پھر پروفیسر قدوسہ صاحبہ نے اس کا انگریزی میں ترجمہ کیا جس کا دو ایڈیشن آچکا ہے، اس کا تلگو ترجمہ جناب شیخ محمد اسحاق صاحب (کڑپہ اسلامک سوسائٹی آندھرا پردیش) نے طبع کیا، اس کا ملیالم ترجمہ مولانا عبدالشکور قاسمی زید مجدہ (کیرالہ) اور ہندی ترجمہ مولانا انوار اللہ فلک قاسمی (بہار) کرارہے ہیں، اور امید ہے کہ جلد ہی اس کی اشاعت عمل میں آئے گی۔

حضرت مولانا شاہ فضل الرحیم مجددی سکریٹری مسلم پرسنل لا بورڈ نے جے پور کے اجلاس 2015 کے موقع سے بھی اس کے اردو اور انگریزی ترجمہ کو شائع کیا تھا اور اب یہ تازہ ایڈیشن بھی ان کی توجہ سے شائع ہو رہا ہے، بورڈ کے ایک موجودہ جنرل سکریٹری حضرت مولانا سید محمد ولی رحمانی صاحب بھی تفہیم شریعت کے شعبہ کو خصوصی اہمیت دیتے ہیں، یہ اس حقیر کے لئے بہت حوصلہ افزا ہے، اللہ تعالی ان سب حضرات کو بہتر سے بہتر اجر عطا فرمائے اس حقیر کوشش کو قبول فرمائے اور شکوک وشبہات کے کانٹے شریعت اسلامی کے خلاف بوئے جا رہے ہیں ان کو نکالنے میں مدد و معاون ثابت ہو، واللہ ہو المستعان

خالد سیف اللہ رحمانی

کم عمری کی شادی

جولوگ شادی کے لئے ایک مخصوص عمر متعین کرنا چاہتے ہیں، ان کا خیال ہے کہ کم عمری کی شادی لڑکیوں کی صحت کے لئے نقصان دہ ہے؛ کیوں کہ جسمانی نشو ونما کی تکمیل اورتولید کی مناسب صلاحیت پیدا ہونے سے پہلے ہی ان کو ماں بننا پڑتا ہے، جس سے ان کی صحت پر منفی اثر پڑتا ہے، اس سلسلہ میں کئی باتیں قابل غور ہیں:

طبی نقطہ نظر

اول یہ کہ جسمانی نشوونما تمام لڑکوں اور لڑکیوں میں یکساں نہیں ہوتی، موسمی حالات، غذا، ماحول اور موروثی اثرات کے تحت بلوغ کی عمر مختلف ہوتی ہے، اور جسمانی قوی اورتولید کی صلاحیت میں بھی فرق ہوتا ہے، نہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ ۱۸ رسال سے کم عمر کی ہرلڑکی کے لئے ماں بننا نقصان دہ ہے، اور نہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ ۱۸ رسال کے بعد لڑکیوں میں لامحالہ ایسی صلاحیت پیدا ہوجاتی ہے کہ ماں بننا ان کی صحت کے لئے مضرت رساں نہ ہو؛ اس لئے ۱۸ رسال ہی کی تعیین قابل فہم نہیں، قانون فطرت کے تحت عورت کی اس صلاحیت کا اصل معیار وہی ہے کہ جب وہ بالغ ہوجاتی ہے تو اس میں بنیادی طور پر حاملہ ہونے کی صلاحیت بھی پیدا ہوجاتی ہے۔

اخلاقی پہلو

دوسرا قابل غور پہلو یہ ہے کہ اس وقت ٹی وی کے فروغ، فحش رسائل کی بکثرت،

انٹرنیٹ اور بے ہودہ فلموں کے ویڈیو اوران فلموں تک کم عمرلڑکوں کی رسائی کی وجہ سے صورت حال یہ ہے کہ نابالغ بچے تک جنسی بے راہ روی میں مبتلا ہورہے ہیں، شادی سے پہلے ناجائز اسقاط حمل کی کثرت ہوگئی ہے، سوال یہ ہے کہ کم عمری کا نکاح زیادہ نقصان دہ ہے یا کم عمری کے جنسی تجربات؟ یقیناً بے قید جنس پرستی زیادہ مضر ہے، تو اگر ایسے حالات پیدا ہوجائیں کہ ماں باپ اپنے لڑکوں اورلڑکیوں کے اخلاق وکردار کی حفاظت کے لئے بلوغ کے بعد جلد سے جلد ان کا نکاح کردینا مناسب سمجھتے ہوں تو کیا یہ بات مناسب نہیں ہوگی کہ انہیں اس عمر سے پہلے ہی نکاح کی اجازت دی جائے؛ تاکہ وہ اپنے بچوں کو فساد اور بگاڑ کے گڑھے میں جانے سے بچا سکیں، اصل مسئلہ Child Marraige کا نہیں، بلکہ Child Sex کا ہے، حکومت کو اور سماجی تنظیموں کو چاہئے کہ یہ جو بے راہ روی کا طوفان ملک میں آرہا ہے، اور ہماری تعلیم گاہوں کو اپنا ہدف بنارہا ہے، پہلے اس کے سد باب کی کوشش کریں، مثلاً امریکہ میں ۱۲ر سے ۱۷رسال کے بچوں کی طرف سے دوسرے بچوں کے ساتھ جو جنسی زیادتی ۲۰۰۴ میں ریکارڈ کی گئی ہے، وہ لڑکوں کی طرف سے ۱۲۴۵۰ اور لڑکیوں کی طرف سے ۹۷۹ ہے۔

(Source: US Department of Justice, Federal Bereau of Investigation-2004)

اگرچہ یہ امریکہ کے اعداد و شمار ہیں، ہندوستان کے اعداد و شمار دستیاب نہیں ہوسکے، لیکن اگر صحیح صورت حال سامنے آئے تو شاید ہندوستان کی صورت حال اس سے مختلف نہ ہو۔

حقیقی صورت حال

تیسری بات یہ ہے کہ کم سنی کے نکاح کے واقعات اب خود ہی کم ہوتے جارہے

ہیں، چودہ پندرہ سال کی عمر میں تولڑکے اورلڑکیاں میٹرک کرتے ہیں، اب لڑکوں کے ساتھ ساتھ لڑکیوں میں بھی اعلیٰ تعلیم کا رجحان روز افزوں ہے، اور تعلیم کے درمیان عام طور پر شادی نہیں کی جاتی، لڑکوں کے لئے تو تعلیم کے بعد حصول روزگار کا بھی مسئلہ ہے، اس لئے اس تلاش روزگار میں کئی سال نکل جاتے ہیں، اور اس کے بعد ہی لڑکے شادی کی طرف راغب ہوتے ہیں، اس طرح قانون میں جو عمر متعین کی گئی ہے، عام طور پر اس سے کہیں زیادہ عمر میں لڑکوں اور لڑکیوں کی شادیاں ہوتی ہیں، جوں جوں تعلیم بڑھتی جائے گی، خود کم سنی میں نکاح کا رجحان کم ہوتا جائے گا، اور جب تک تعلیم عام نہ ہوگی صرف قانون کے ذریعہ اس مقصد کو حاصل نہیں کیا جا سکتا؛ کیونکہ ایسی شادی کے واقعات شہر میں بہت کم پیش آتے ہیں، زیادہ تر دور دراز دیہاتوں میں اس طرح کا رواج پایا جاتا ہے اور اس کی نوبت بہت کم آتی ہے کہ وہ معاملات عدالت کے سامنے آئیں؛ اس لئے ایسے واقعات قانون کے دائرہ سے باہر ہی رہتے ہیں، اس کا اندازہ ۱۸؍سا سے کم عمر کی لڑکیوں کی شادی کے سلسلہ میں درج ذیل اعداد و شمار سے لگایا جا سکتا ہے:

43,4	:	1981
35,3	:	1991
14,4	:	2001
3,7	:	2011

صرف مسلم مسئلہ نہیں

چوتھی بات یہ ہے کہ بعض لوگ اس کو مسلمانوں کے ایک سماجی مسئلہ کی نظر سے دیکھتے ہیں؛ حالانکہ کم سنی کی شادی کے واقعات مسلمانوں میں بہت کم ہیں، خود ہندوؤں

میں ان سے کہیں زیادہ ہیں، راجستھان میں اب بھی ''اکھاتیج'' کے موقع پر ہزاروں شیر خوارلڑکیوں کی شادی کردی جاتی ہے، راجستھان، مدھیہ پردیش، اڑیسہ اور ہریانہ وغیرہ کے بعض علاقوں میں ہندوسماج میں بہت ہی کم سنی میں نکاح کا رواج پایا جاتا ہے اور اس کا تناسب مسلمانوں سے کہیں زیادہ ہے، مثلاً ۲۰۱۱ کے ایک سرکاری سروے رپورٹ کے مطابق ۱۰؍سال سے کم عمر کے لڑکے اورلڑکیوں کی شادی کا تناسب ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان اس طرح ہے:

ہندولڑکے:	3,56	مسلم لڑکے :	0,49
ہندولڑکیاں:	6,65	مسلمان لڑکیاں :	0,88

کم سنی کے نکاح زیادہ تر چونکہ دیہاتوں میں ہوتے ہیں ، اس لئے شہر اور دیہاتوں کے اعتبار سے بھی اس کا تناسب ذکر کیا گیا ہے:

دیہی علاقہ

ہندولڑکیاں	50,34فی لاکھ
مسلمان لڑکیاں	2,62فی لاکھ
ہندولڑکے	23,93فی لاکھ
مسلمان لڑکے	5,34فی لاکھ

شہری علاقے

ہندولڑکیاں	16,16فی لاکھ
مسلمان لڑکیاں	3,39فی لاکھ

ہندولڑکے	11,67فی لاکھ
مسلمان لڑکے	2,29فی لاکھ

(Source: Census of India/India Spend)

اصل مسئلہ ان رواجات کو روکنا ہے، بالخصوص اس پس منظر میں کہ ہندو معاشرہ میں نکاح کے معاملہ میں لڑکی رضامندی اور ناراضگی کو بہت کم اہمیت دی جاتی ہے اور ان پر رشتے تھوپ دیئے جاتے ہیں، خاص کر کم عمری میں کئے گئے نکاح میں اصل عاقدین کا کوئی حصہ نہیں ہوتا، مگر اسلام میں اکثر حالات میں نابالغی کے نکاح کی صورت میں بالغ ہونے کے بعد لڑکے اور لڑکی کو خیار بلوغ حاصل ہوتا ہے اور وہ اس نکاح کو رد کر سکتے ہیں۔

ترغیب نہیں اجازت

پانچویں بات یہ ہے کہ اس سلسلہ میں اسلامی نقطہ نظر کو بھی سمجھنے کی ضرورت ہے، ایسا نہیں ہے کہ اسلام میں کم سنی اور نابالغی کے نکاح کو زیادہ بہتر قرار دیا گیا ہے، مسلم معاشرہ میں ہمیشہ سے یہ معمول رہا ہے کہ لڑکے اور لڑکیوں کے بالغ ہونے کے بعد ہی ان کا نکاح کیا جاتا ہے، خود قرآن مجید نے بھی اس کی طرف اشارہ کیا ہے، کہ یتیموں کو آزماؤ، جب وہ نکاح کو پہنچ جائیں اور تم ان سے ہوش مندی محسوس کرو تو ان کا مال ان کے حوالہ کردو:

”**وابتلوا اليتامى حتى إذا ابلغوا النكاح فإن انستم منهم رشدا فادفعوا إليهم أموالهم**“(نساء:٦)۔

نکاح کو پہنچنے سے مراد بالغ ہونا ہے؛ چنانچہ امام ابوبکر جصاص رازیؒ فرماتے ہیں: ”**هو بلوغ حال النكاح من الاحتلام**“(احکام القرآن ٢/ ٦٣)، اور مشہور مفسر علامہ جلال الدین سیوطی فرماتے ہیں: ”**أي صاروا محلاله بالاحتلام**“ (جلالین/ ٧٠)، یعنی

نکاح کو پہنچنے سے مراد یہ ہے کہ وہ احتلام کی وجہ سے نکاح کے اہل ہو جائیں۔

ان آیات سے واضح ہے کہ بہتر طریقہ یہی ہے کہ بالغ ہونے کے بعد لڑکوں اور لڑکیوں کے نکاح کئے جائیں۔

پھر اسلام میں رشتہ کے انتخاب کی جو آزادی عاقدین کو دی گئی ہے، اور اس سلسلہ میں لڑکوں کی طرح لڑکیوں کو بھی اپنی ذات کے بارے میں فیصلہ کرنے کا جو اختیار دیا گیا ہے، اس کا تقاضا بھی یہی ہے؛ کیوں کہ بالغ ہونے کے بعد ہی وہ قانونا اس اختیار کو استعمال کرنے کے اہل ہوں گے اور اس عمر کو پہنچنے کے بعد ہی انسان کے اندر بھلے اور برے کی تمیز بھی پیدا ہوتی ہے، خود پیغمبر اسلام ﷺ نے اپنی صاحبزادیوں کا نکاح عمر بلوغ کو پہنچنے کے بعد ہی فرمایا ہے، اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اصل یہی ہے کہ بالغ ہونے کے بعد نکاح ہو؛ لیکن اس کے ساتھ ساتھ اسلام نے بالغ ہونے سے پہلے بھی نکاح کی گنجائش رکھی ہے، اور مختلف صحابہ نے کم عمری میں بچوں کے نکاح کئے ہیں۔

مصلحت کا تقاضا

یہ اجازت اس لئے دی گئی ہے کہ بعض دفعہ مصلحت کا تقاضا یہی ہوتا ہے، اس سلسلہ میں دو مصلحتیں تو بہت ہی بنیادی ہیں، ایک یہ کہ بعض اوقات اخلاقی بگاڑ کا اندیشہ ہوتا ہے، نکاح کی وجہ سے ایک جائز راستہ کھل جاتا ہے، اور یہ بات اسے ناجائز رخ پر لے جانے سے بچاتی ہے، اگر ایسے حالات سامنے ہوں اور ۱۸؍سال تک نکاح کو روکے رکھا جائے تو اس سے بہت سے اخلاقی مفاسد پیدا ہو سکتے ہیں، اور یہ اخلاقی بگاڑ بیک وقت صحت جسمانی کے لئے بھی مضر ہے، اور ساتھ ہی ساتھ سماج کے دوسرے لوگ بھی اس سے متاثر ہوتے ہیں؛ کیونکہ کوئی شخص جب اخلاقی مفاسد کا مرتکب ہوتا ہے تو اس کے لئے سماج

ہی میں اپنی غذا تلاش کرتا ہے، اسلام میں حفاظت اخلاق کی بڑی اہمیت ہے، اور والدین بھی اس سلسلہ میں جوابدہ ہیں، چنانچہ حضرت ابوسعید خدریؓ اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جس کو بچہ ہو، تو اسے چاہئے کہ اس کا اچھا نام رکھے، اور اس کی تربیت کرے، پھر جب وہ بالغ ہوجائے تو اس کا نکاح کردے، اگر بالغ ہونے کے باوجود اس کا نکاح نہیں کیا، اور وہ گناہ میں مبتلا ہوگیا تو اس کے باپ پر بھی اس کا گناہ ہوگا: ''فإنما إثمه على أبيه'' (شعب الایمان، حقوالاولادوالہلین، حدیث نمبر: ۸۲۹۹)۔

دوسری اہم مصلحت یہ ہے کہ بعض دفعہ باپ لب گور ہوتا ہے، ظاہری حالات کے تحت اندیشہ ہے کہ اس کے بچوں کو یتیمی کا داغ لگنے والا ہے، اور اس کی موت کے بعد خاندان میں ایسے ذمہ دار اور دیانت دار لوگ نہیں ہیں، جن سے امید رکھی جاسکے کہ وہ صحیح طور پر بچوں کی تربیت کرسکیں گے اور مناسب رشتہ تلاش کر کے اس کے بے سہارا بچوں کی شادی کریں گے، ابھی بچے نابالغ ہیں؛ لیکن ایک موزوں اور مناسب رشتہ ہاتھ آرہا ہے، تو ایسی صورت میں یقیناً مصلحت یہی ہے کہ اس وقت اس کا نکاح کردیا جائے کہ اس میں اس کے لب گور سرپرست کے لئے سکون قلب بھی ہے، اور اس کے بچوں کے مستقبل کے محفوظ ہونے کی امید بھی۔

یقیناً یہ مصلحتیں ایسی نہیں ہیں، جنہیں نظر انداز کردیا جائے، اس لئے قانون ایسا بنانا چاہئے جس میں مفادات کو حاصل بھی کیا جائے اور نقصانات سے حفاظت بھی ہو، یہ کہا جاسکتا ہے کہ جہاں تک ممکن ہو نابالغی کے نکاح سے بچا جائے، اگر باپ اور دادا کے علاوہ دوسرے اولیاء نکاح کریں یا باپ یا دادا ہی نکاح کریں، لیکن وہ اپنے اختیارات کا صحیح استعمال کرنے کے اہل نہ ہوں تو بالغ ہونے کے بعد لڑکوں اور لڑکیوں کو اس نکاح کے باقی

رکھنے یا ختم کر دینے کا اختیار دیا جائے، یہ حدود و قیود جن کی اسلام میں رعایت کی گئی ہے، اگر ملحوظ ہوں تو کم سنی کے نکاح کی مضرتوں سے بچا بھی جا سکتا ہے، اور اس کی مصلحتیں حاصل بھی کی جا سکتی ہیں۔

اسلامی نقطہ نظر

بعض حضرات کو غلط فہمی ہے کہ اسلام میں نکاح نابالغہ کی اجازت نہیں دی گئی ہے، علماء اسلام نے اپنے طور پر اس طرح کی بات لکھ دی ہے؛ حالانکہ یہ بالکل غلط ہے، حقیقت یہ ہے کہ حالت نابالغی کے نکاح کا درست ہونا قرآن مجید سے بھی ثابت ہے، احادیث سے بھی اور اجماع امت سے بھی، نیز جب لڑکے اور لڑکیاں جسمانی طور پر بالغ ہو جائیں تو ان کا نکاح جلد کر دینا چاہیئے، اس کا حکم بھی قرآن و حدیث میں موجود ہے اور فقہاء اسلام نے بھی اس کی صراحت کی ہے۔

ایسے حضرات کی غلط فہمیاں دور کرنے کے لئے نمبروار چند نکات تحریر کئے جاتے ہیں:

قرآن مجید

۱- نابالغی کی حالت میں نکاح کرنے کی اگر چہ قرآن مجید میں ترغیب نہیں دی گئی ہے؛ لیکن قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ ایسا نکاح کرنا جائز ہے؛ چنانچہ اللہ تعالی کا ارشاد ہے:

”واللاتی یئسن من المحیض من نسائکم إن ارتبتم فعدتهن ثلاثة اشهر وللاتی لم یحضن وولات الاحمال اجلهن أن یضعن حملهن“(سورۂ طلاق: ۴)۔

(جو عورتیں حیض کے آنے سے ناامید ہو گئی ہیں، اگر تمہیں شبہ ہو تو ان کی عدت

تین مہینے ہے اوران عورتوں کی بھی جن کوابھی حیض آیا ہی نہ ہو)۔

اس آیت میں طلاق کی عدت کا ذکر ہے اور طلاق اسی وقت واقع ہوتی ہے، جب پہلے نکاح ہو چکا ہو، تو معلوم ہوا کہ نابالغ لڑکیاں جن کوابھی حیض کا سلسلہ شروع بھی نہ ہوا ہو، ان کا بھی نکاح ہوسکتا ہے اور نکاح کے بعد وہ بھی طلاق سے دوچار ہوسکتی ہیں......اس کی مزید وضاحت اس روایت سے ہوتی ہے کہ جب مطلقہ عورتوں کی عدت کے تین حیض ہونے کا حکم قرآن مجید میں نازل ہوا تو حضرت ابی بن کعب، حضرت خلاد بن نعمان اور بعض صحابہؓ نے رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا کہ جن عورتوں کو درازی عمر یا نابالغی کی وجہ سے حیض نہ آیا ہو، ان کی عدت کیا ہوگی؟ آیت میں ایسی ہی عورتوں کی عدت کا ذکر کیا گیا ہے، مشہور مفسر علامہ شہاب الدین آلوسی نے اسی بات کو ان الفاظ میں نقل کیا ہے:

"وفی روایة ان قوما منهم أبی بن کعب وخلادبن النعمان لما سمعوا قوله تعالی:"والمطلقات یتربصن بأنفسهن ثلاثة قروء" قالوا: یا رسول الله ﷺ!فما عدة من لا قرء لها من صغر أو کبر؟فنزل"واللائی لم......الآیة"واللائی لم یحضن: المراد الصغار اللائی لم یبلغن سن الحیض" (روح المعانی، سورۂ طلاق: ۱۵/ ۲۰۲)۔

حدیثیں

۲-قرآن مجید کے علاوہ مختلف حدیثیں بھی نابالغی کے نکاح کے جائز ہونے کو بتلاتی ہیں، چند کا یہاں ذکر کیا جاتا ہے:

الف-"عن عائشة رضی الله عنها أن رسول الله ﷺ تزوجها

وهی بنت ست، وبنی بها وهی بنت تسع"(مسلم:باب تزویج الأب البکر الصغیرۃ حدیث نمبر ۱۴۲۲، ابوداؤد، باب فی تزویج الصغار، حدیث نمبر:۲۱۲۱، نسائی، باب نکاح الرجل ابنتہ الصغیر حدیث نمبر:۳۲۵۵)(حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ان سے نکاح کیا، جب وہ چھ سال کی تھیں اور جب نو سال کی ہوئیں تو رخصتی ہوئی)۔

ب-"**عن الحسن قال قال رسولالله ﷺ: اذا أنکح الرجل ابنه وهو کاره فلیس بنکاح، واذا زوجه وهو صغیر جاز نکاحه**"(مصنف ابن ابی شیبہ، باب فی رجل یزوج ابنہ وہو صغیر، حدیث نمبر:۱۶۰۱۰)۔

(حضرت حسنؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ کوئی شخص اپنے بیٹے کا نکاح کردے؛ حالانکہ وہ اس پر راضی نہیں ہے، تو نکاح نہیں ہوا؛ البتہ اگر وہ نابالغ ہو تو نکاح جائز ہوگا)۔

آثار صحابہ

۳-رسول اللہ ﷺ کے صحابہ کے اقوال و افعال کو شریعت میں خصوصی اہمیت حاصل ہے، چنانچہ صحابہ کے عمل سے بھی نابالغی کا نکاح ثابت ہوتا ہے، شمس الائمہ ابوبکر السرخسی (متوفی:۴۸۳ھ) نقل کرتے ہیں:

☆"**فإن قدامة بن مظعون تزوج بنت الزبیر یوم ولدت وقال:إن مت فهی خیرورثتی، وان عشت فهی بنت الزبیرؓ**"۔

(حضرت قدامہ بن مظعونؓ نے حضرت زبیرؓ کی صاحبزادی سے ان کی پیدائش ہی کے دن نکاح کرلیا اور کہا کہ اگر میری موت ہوجائے تو وہ میری بہترین وارث ہے اور اگر میں زندہ رہوں تو وہ زبیرؓ کی بیٹی ہے)۔

☆"**وزوج ابن عمر بنتاله صغیرة من عروة بن الزبیرؓ**"۔

(عبداللہ بن عمرؓ نے اپنی نابالغ بچی کا نکاح عروہ بن زبیرؓ سے کیا)۔

☆"زوج عروة بن الزبير بنت أخيه وهما صغيران"۔

(عروہ بن زبیر نے اپنی بھتیجی کا نکاح اپنے بھانجے سے کردیا، جبکہ وہ دونوں نابالغ تھے)۔

☆"ووهب رجل ابنته الصغيرة من عبد الله بن الحسن فأجاز ذلک عليؓ"۔

(ایک صاحب نے اپنی نابالغہ لڑکی عبداللہ بن حسن کے نکاح میں دی، حضرت علیؓ نے اس کو نافذ کردیا)۔

☆"وزوجت امرأة ابن مسعود بنتالها صغيرة ابنا للمسيب بن نخبة فأجاز ذلک عبد اللهؓ" (کتاب المبسوط ۴/۲۰۸ باب نکاح الصغیر، الخ)۔

(حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی بیوی نے اپنی نابالغہ بیٹی کا نکاح مسیّب بن نخبہ کے بیٹے سے کردیا اور عبداللہ بن مسعودؓ نے اس کو نافذ قرار دیا)۔

نیز علامہ نووی نقل کرتے ہیں:

"فصل: ويجوز لولى الصبى أن يزوجه اذا رأى ذلک، لما روى: أن عمرؓ زوج ابنا له صغيرا" (شرح المہذب ۱۷/۱۹۷ فصل فی تزویج الصبی)۔

(نابالغ بچے کے ولی کے لئے جائز ہے کہ وہ اس کا نکاح کردے، اگر وہ اس کو مناسب سمجھتا ہو؛ کیونکہ حضرت عمرؓ نے اپنے نابالغ لڑکے کا نکاح کردیا تھا)۔

نیز حدیث کی معروف کتاب مصنف عبدالرزاق میں ہے:

"عن الزهرى أن عروة بن الزبير أنكح ابنه صغيرا ابنة المصعب

صغيرة"(مصنف عبدالرزاق، کتاب النکاح ۱۰۳۵۸)۔

(ابن شہاب زہری سے مروی ہے کہ عروہ بن زبیر نے اپنے نابالغ بیٹے کا نکاح مصعب کی نابالغ بیٹی سے کر دیا تھا)۔

اجماع امت

۴- کتاب اللہ، سنت رسول اللہ ﷺ اور آثار صحابہ کے بعد شریعت میں چوتھی اہم دلیل مسلمانوں کا اجماع و اتفاق ہے؛ چنانچہ علامہ ابن منذر کہتے ہیں:

"**أجمع كل من نحفظ عنه من أهل العلم، أن نكاح الأب ابنته البكر الصغيرة جائزة**"(المغنی ۹/۳۹۸ کتاب النکاح)۔

(جن اہل علم کی رائیں ہم تک پہنچی ہیں، ان سب کا اتفاق ہے کہ باپ کا اپنی نابالغہ کنواری لڑکی کا نکاح کر دینا جائز ہے)۔

نیز عصر حاضر کے ایک صاحب علم سعدی ابوجیب نے اجماعی احکام کو جمع کیا ہے، وہ فرماتے ہیں:

"**أجمعوا على أن انكاح الأب ابنه الصغير جائز......وإن إجماع المسلمين على أن للأب أن يزوج ابنته الصغيرة**"(موسوعۃ الاجماع فی الفقہ الاسلامی ۳/۱۱۸۵)۔

(فقہاء کا اس بات پر اتفاق ہے کہ باپ اپنے نابالغ بیٹے کا نکاح کرسکتا ہے......اور اس پر بھی مسلمانوں کا اتفاق ہے کہ باپ اپنی نابالغ بیٹی کا نکاح کرسکتا ہے)۔

بلوغ کے بعد نکاح میں عجلت

۵- جب لڑکے یا لڑکیاں بالغ ہوجائیں تو ان کا نکاح جلد کر دینا چاہئے؛ تاکہ وہ

گناہ میں مبتلا نہ ہوں؛ چنانچہ قران مجید میں بھی غیر شادی شدہ بالغ لڑکوں اور لڑکیوں کے نکاح کا حکم دیا گیا ہے، ارشاد ہے:"وأنکحوا الایامی منکم"(سورۂ نور:۳۲)اس کے علاوہ متعدد حدیثوں میں بھی اس کا ذکر موجود ہے؛ چنانچہ بعض احادیث یہاں نقل کی جاتی ہیں:

الف-"**لقد قال لنا رسول الله ﷺ: یا معشر الشاب من استطاع منکم الباء ة فلیتزوج، فإنه أغض للبصر وأحصن للفرج**"(صحیح مسلم، کتاب النکاح، حدیث نمبر ۳۳۹۸)۔

(رسول اللہ ﷺ نے ہم لوگوں سے فرمایا: اے نوجوانوں کا گروہ! تم میں سے جو بیوی کے مالی حقوق ادا کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو، اسے نکاح کرلینا چاہئے؛ اس لئے کہ یہ نگاہوں کو پست رکھنے والا اور عصمت وعفت کا محافظ ہے)۔

ب-"**عن عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ وأنس بن مالک عن رسول الله ﷺ قال: فی التوراة مکتوب من بلغت ابنته اثنتی عشرة سنة ولم یزوجها فأصابت إسما، فإثم ذلک علیه**"(بیہقی فی شعب الایمان، باب فی حقوق الاولاد، حدیث نمبر:۸۶۶۹)۔

(حضرت عمرؓ اور انسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: تورات میں لکھا ہوا ہے کہ جس کی بیٹی بارہ سال کی عمر کو پہنچ گئی، اس نے اس کا نکاح نہیں کیا اور وہ گناہ کی مرتکب ہوئی تو اس کا گناہ اس کے باپ پر ہوگا)۔

ج-"**عن ابن عباسؓ قال: قال رسول الله ﷺ من ولد له ولد فلیحسن اسمه وأدبه فاذا بلغ فلیزوجه، فان بلغ ولم یزوجه فما أصاب إثما فإنما إثمه علی أبیه**"(شعب الایمان للبیہقی، حقوق الاولاد والاہلین، حدیث نمبر:۸۲۹۹)۔

(حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جس کو بیٹا ہو، وہ اس کا اچھا نام رکھے اور بہتر تربیت کرے، پھر جب بالغ ہوجائے تو اس کا نکاح کردے، اگر بالغ ہوگیا اور اس کا نکاح نہیں کیا، پھر اس نے کوئی گناہ کیا تو اس کا گناہ اس کے باپ پر بھی ہوگا)۔

غرض کہ بالغ ہونے کے بعد جلد سے جلد نکاح کرنے کا حکم ہے، فقہاء نے بھی صراحت کی ہے کہ جب کسی لڑکے یا لڑکی میں صنف مخالف کی طرف شدید اشتیاق پیدا ہوجائے تو نکاح کردینا فرض ہے؛ چنانچہ حنفی فقیہ علامہ ابن نجیم مصری فرماتے ہیں:

''(وعند التوقان واجب)المراد به أن يخاف عنه الوقوع فى الزنا لولم يتزوج، إذا لا يلزم من الاشتياق الى الجماع الخوف المذكور، وأراد بالواجب الازم، فليشمل الفرض والواجب الاصطلاحى، فانا قدمنا أنه فرض وواجب''(البحرالرائق ۳/ ۱۴۲ کتاب النکاح)۔

(شدت اشتیاق کے وقت نکاح کرنا واجب ہے) اس سے مراد یہ ہے کہ اگر نکاح نہ کرے تو زنا میں پڑ جانے کا اندیشہ بھی ہو؛ کیونکہ ہم بستری کی رغبت سے لازماً زنا میں پڑ جانے کا اندیشہ نہیں ہوتا اور واجب سے ''لازم'' ہونا مراد ہے؛ لہذا یہ فرض اور اصطلاحی واجب دونوں کو شامل ہے؛ چنانچہ ہم ذکر کرچکے ہیں کہ نکاح کبھی فرض بھی ہوتا ہے اور کبھی واجب بھی)۔

یہی بات علامہ کاسانیؒ نے ''بدائع الصنائع''(۲/ ۴۹۸ کتاب النکاح) میں اور علامہ حصکفی وعلامہ شامی نے ''الدر المختار مع رد المحتار''(۴/ ۶۳ کتاب النکاح) میں تحریر کی ہے۔

اسی طرح علامہ ابن قدامہ حنبلیؒ فرماتے ہیں:

"......**منهم من يخاف على الوقوع فى محظور إن ترک النكاح، فهذا يجب عليه النكاح فى قول عامة الفقهاء لأنه يلزمه اعفاف نفسه وصونها عن الحرام وطريقه النكاح**" (المغنی ۹/۳۴۰-۳۴۱ کتاب النکاح)۔

(جس کو نکاح نہ کرنے کی صورت میں کسی ناجائز فعل میں پڑ جانے کا اندیشہ ہو، جمہور فقہاء کے قول کے مطابق اس کے لئے نکاح کرنا واجب ہے؛ کیونکہ اپنے آپ کو پاکباز رکھنا اور حرام سے بچانا واجب ہے اور اس کی صورت نکاح ہے)۔

اور یہ بات قابل لحاظ ہے کہ آغاز شباب میں جذبات کی شدت زیادہ ہوتی ہے اور ایسے موقع پر نکاح سے روک دینا گناہ کی طرف قدم بڑھانے کا سبب بن سکتا ہے۔

خلاصہ بحث

حاصل یہ ہے کہ اسلام نے کم سنی میں لڑکے یا لڑکی کے نکاح کی ترغیب نہیں دی ہے؛ البتہ اس سے منع بھی نہیں کیا ہے اور اس کی گنجائش رکھی ہے، جس کا ثبوت قرآن مجید سے بھی ہے، حدیث سے بھی ہے، آثار صحابہ سے بھی ہے اور اس امت کا اجماع واتفاق بھی ہے، نیز یہ حکم بعض مصالح پر مبنی ہے۔

البتہ بالغ ہونے کے بعد تاکید کے ساتھ نکاح میں عجلت کا حکم دیا گیا ہے؛ کیونکہ اس سے اخلاقی اقدار کا تحفظ متعلق ہے اور نکاح میں تاخیر سے اخلاقی بگاڑ پیدا ہونے کا اندیشہ ہے، جو ایک پاکیزہ سماج کے لئے ہرگز مناسب نہیں، نیز یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ مسلمانوں میں کم سنی کی شادی کا رواج بمقابلہ برادران وطن سے بہت کم ہے اور خیار بلوغ کے ذریعہ اس کی تلافی کی گنجائش موجود ہے۔

تعدد ازدواج کا مسئلہ

تعدد ازدواج Poly Gamy کا مسئلہ ان سماجی مسائل میں سے ہے جو آزادی نسواں کی تحریک کے بعد سے پوری دنیا میں زیر بحث رہا ہے، اور اسلام کے معاشرتی قوانین کے خلاف اہل مغرب کی طرف سے جو بے جا اور نا منصفانہ فرد جرم عائد کی جاتی رہی ہے، ان میں یہ مسئلہ سرفہرست ہے، انسان کی ایک فطری کمزوری یہ ہے کہ وہ جس بات کو بار بار اور مختلف زبانوں سے سنتا ہے، خواہ وہ کتنی ہی غلط بات ہو، اس کو درست سمجھنے لگتا ہے؛ چنانچہ تعدد ازدواج کے مسئلہ پر مغربی دنیا نے اتنا لکھا اور کہا ہے کہ بہت سے مسلمان بھی اس سلسلہ میں شک و تذبذب میں مبتلا ہیں، اور جن لوگوں نے مغربی ماحول میں یا مغربی نظام کے تحت تعلیم حاصل کی ہے، وہ بے چارے تو اس مسئلہ پر اتنے شرمسار ہو جاتے ہیں کہ شاید عرق ندامت پیشانی سے گذر کر پاؤں تک پہنچ جاتا ہو؛ اس لئے اس مسئلہ پر حقیقت پسندی کے ساتھ غور کرنے کی ضرورت ہے!

تعدد ازدواج کا مسئلہ کئی پہلوؤں سے قابل غور ہے: مذہبی، سماجی اور اخلاقی۔

ہندو مذہب

مذہبی اعتبار سے یہ ایک حقیقت ہے کہ تقریباً دنیا کے تمام مذاہب میں تعدد ازدواج کو جائز قرار دیا گیا ہے، ڈاکٹر مالک رام نے رگ وید (۱۰:۱۰۸-۱۰۵) کے حوالہ سے لکھا ہے کہ ایک مرد کے لئے بیک وقت ایک سے زیادہ نکاح کرنا درست ہے اور

بیویوں کے لئے کوئی تحدید نہیں ہے، ہندو مذہبی کتابوں میں بہ کثرت ایک سے زیادہ نکاح کا ذکر ملتا ہے، جیسے:

☆Aitareya Brahmana میں ہے:

''ایک مرد کی بہت سی بیویاں ہوسکتی ہیں؛ لیکن عورت بہت سے شوہر نہیں رکھ سکتی''۔

☆Apastamba میں ہے:

''اگر شوہر کے پاس ایک بیوی ہے، جو اپنی مذہبی ذمہ داریوں کو پورا کرنے کی خواہش مند ہو اور ذمہ داریوں کو پورا کرنے کی اہل بھی ہو اور جولڑکے جن سکتی ہو، تو اس صورت میں شوہر دوسری بیوی نہیں رکھ سکتا؛ لیکن اگر کسی کی بیوی ان دونوں صلاحیتوں میں کسی ایک سے محروم ہے تو اس حالت میں اس شوہر کے لئے دوسری بیوی رکھنا جائز ہے؛ لیکن قبل اس کے وہ اگنی ہوتر کی آگ روشن کرے''۔

☆Devala میں ہے:

''شودر کے لئے صرف ایک بیوی رکھنے کی اجازت ہے، ویش کے لئے دو، چھتری کے لئے تین، برہمن کے لئے چار؛ لیکن بادشاہ کے لئے جتنی چاہے، اتنی بیویاں رکھنے کی اجازت ہے''۔

☆Gautama میں ہے:

''برہمن کے لئے تین، چھتری کے لئے دو، ویش اور شودر کے لئے صرف ایک رکھنے کی اجازت ہے، اگر کسی عورت کا شوہر غائب ہوجائے تو اس کو چھ سال انتظار کرنا چاہئے، اگر اس کا پتہ چل جائے تو اس کو اپنے شوہر کے پاس چلے جانا چاہئے''۔

(The Institution of Pologamy in Modern India and the Contemporary Islamic World. Faculty of Law, Delhi University P.G. 119)

☆مہابھارت میں ہے:

''اس دنیا میں ظاہر ہوئے بھگوان واسودیو کی سولہ ہزار ایک سو ایک رانیاں ہوئیں، ان میں رکمنی، ستیہ بھاماں، جاموتی، چاروہاسی وغیرہ آٹھ رانیاں مشہور ہوئیں (مہابھارت انش:۴-۱۵)۔

رکمنی کے علاوہ شری کرشن کی جو سات رانیاں تھیں، ان کے نام کالندی، متراوندا، ستیا، کام روپڑی، جاموونی، روانی، مدراجستا بھدرا، استراجت ستا، ستیہ بھاماں، خوبصورت ہاس والی لکشمن بہت خوبصورت تھی، ان کے علاوہ شری کرشن کی سولہ ہزار رانیاں تھیں (مہابھارت انش ۵-۲۸)۔

☆Taittirya Sanhita میں ہے:

''ایک مرد دو بیویاں رکھ سکتا ہے، جیسے کہ یگیہ میں لکڑی کے ایک ٹکڑے میں دو ڈوریاں ہوسکتی ہیں؛ لیکن کوئی عورت دو شوہر نہیں رکھ سکتی، جیسے کہ یگیہ میں لکڑے کے ٹکڑوں کے لئے ایک ڈوری نہیں ہوسکتی''۔

☆Baudhayana میں ہے:

''ایک شوہر ایک سے زیادہ عورتوں سے شادی کرسکتا ہے، اگر پہلی بیوی بدزبان ہو''۔

☆Devala میں ہے:

''شودر کے لئے صرف ایک بیوی رکھنے کی اجازت ہے، ویش کے لئے دو، چھتری کے لئے تین، برہمن کے لئے چار؛ لیکن بادشاہ کے لئے جتنی چاہے اتنی بیویاں

رکھنے کی اجازت ہے''۔

Gautama میں ہے:

''برہمن کے لئے تین، چھتری کے لئے دو، ویش اور شودر کے لئے ایک''۔

☆Vishnu میں ہے:

''اب ذاتوں کی مباشرتا ترتیب کے مطابق ایک برہمن چار بیویاں، چھتری تین، ویش دو اور شودر ایک ہی بیوی رکھ سکتا ہے، اگر ایک مرد کی بہت سی بیویاں اپنی ہی قوم کی ہوں تو وہ اپنے مذہبی فرائض کو سب سے بڑی یا سب سے پہلی شادی کے بندھن میں بندھنے والی بیوی کے ساتھ ادا کرے''۔

☆ شری رام چندر کے والد مہاراجہ دشرتھ کی تین بیویاں تھیں: کوشلیا، جو رام چندر جی کی والدہ ہیں، سمترا، جو لکشمن کی والدہ ہیں اور کیکئی جو بھرت کی والدہ ہیں۔

☆اسی طرح راجہ پانڈو کی دو بیویاں تھیں، ایک: کنتی، جن کی اولاد میں سے ارجن ہیں، اور مادری، جن کی اولاد میں سہد یو ہیں (رحمۃ للعالمین ۲/۱۲۸، ہندو مذہب سے متعلق بیشتر معلومات ڈاکٹر شائستہ پروین کی تالیف ''ہندوستانی معاشرہ میں تعدد ازدواج'' سے ماخوذ ہیں)۔

فرانسیسی مؤرخ گستاؤلی بان لکھتے ہیں:

''مثل ہندوستان کے اور خطوں کے راجپوتانہ میں بھی کثرت الازدواج کی رسم موجود ہے، لیلکن راجپوتوں میں ہمیشہ ایک بڑی بیوی رہتی ہے اور پرانے زمانے میں بھی بیوی اپنے شوہر کی لاش کے ساتھ جلائی جاتی تھی، بعض اوقات بیویوں میں آپس میں جھگڑا ہوتا تھا کہ کون ان میں سے اپنے شوہر کے ساتھ جلنے کی عزت حاصل کرے، بادشاہوں کے لئے یہ رسم تھی کہ ان کی کل بیویاں ان کی لاش کے ساتھ جلائی جاتی تھیں، اس وقت تک

اودے پور میں سنگرام سنگھ اوراس کی اکیس رانیوں کا مقبرہ موجود ہے جو ۱۷۳۳ء میں راجہ کے ساتھ جلی تھیں'' (تمدن ہند:۲۹۹)۔

یہودیت میں

یہودی مذہب میں بھی تعدد ازدواج کی گنجائش ہے؛ کیونکہ حضرت ابراہیمؑ جن کی نسل سے بنی اسرائیل بھی ہیں اور بنو اسماعیل یعنی عرب بھی، تورات میں ان کی تین بیویوں کا ذکر ملتا ہے، ایک: حضرت سارہ (پیدائش:۲۹:۱۱)، دوسرے حضرت ہاجرہ جن سے حضرت اسماعیل علیہ السلام پیدا ہوئے (پیدائش:۳۵:۱،۲)، تیسرے: حضرت قطورہ (پیدائش ۳۵:۱،۲)۔

حضرت یعقوب علیہ السلام کی بھی چار بیویوں کا ذکر تورات میں ملتا ہے: ''لیاہ اوران کی کنیز زلفہ اور راخل اوران کی کنیز بلہاہ'' (دیکھئے: پیدائش ۲۹، ۳۰)۔

خود حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دو بیویاں تھیں: ایک: حضرت صفورہ، جو حضرت شعیب علیہ السلام کی صاحبزادی تھیں (خروج ۲:۲۱) آپ کا دوسرا نکاح ایک کوشی خاتون سے ہوا تھا (گنتی:۱:۱۲)- بائبل میں حضرت داؤد علیہ السلام کی چھ بیویوں -احینو عم(Ahinoam)، معکہ (Maachah)، ابیجیل (Abigail)، ابیطال(Abital)، میکل بنت ساؤل(Michal)، حجیت(Haggith) کا ذکر آیا ہے (گنتی ۲۷:۸)۔

حضرت سلیمان علیہ السلام کے بارے میں تورات کا کہنا ہے کہ ان کی سات سو بیویاں اور تین سو حرمین تھیں (سلاطین:۱:۱۱:۳)۔

عیسائیت میں

عیسائی مذہب چونکہ اپنی اصل کے اعتبار سے تورات ہی کی شریعت پر ہے؛ اس

لئے سمجھنا چاہئے کہ اصلا عیسائی مذہب میں بھی تعدد ازدواج کی اجازت ہے؛ چنانچہ شیخ محمود عقاد نے لکھا ہے کہ سترہویں صدی تک خود اہل کلیسا نے تعدد ازدواج کی حمایت کی ہے، فرماتے ہیں:

''مختلف انسانی نظام ازدواج کی تاریخ کے مستند عالم وسٹر مارک Vister) (Marc نے بیان کیا ہے کہ کلیسا اور حکومت دونوں ہی سترہویں صدی کے نصف تک تعدد ازدواج کو مباح قرار دیتے تھے اور ان کے یہاں بکثرت اس کا رواج تھا'' (الفلسفۃ القرآنیۃ: ۵۴)۔

یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ انجیل میں اس کا کہیں اشارہ موجود نہیں ہے کہ ایک سے زیادہ نکاح کی اجازت نہیں؛ لیکن تمثیل کے انداز میں ایک دولہا کے لئے دس کنواریوں کا ذکر ملتا ہے؛ چنانچہ انجیل متی میں ہے:

''اس وقت آسمان کی بادشاہت ان دس کنواریوں کی مانند ہوگی جو اپنی اپنی مشعلیں لے کر دولہا کے استقبال کے لئے نکلیں'' (انجیل متی: ۱۵:۱)۔

اگرچہ کہ کلیسا شروع میں تعدد ازدواج کا مخالف تھا، لیکن بہ قول مالک رام:

''آخر کلیسا کو ہار ماننا پری، ۱۶۵۰ء میں جرمنی کے شہر نورمبرگ میں عیسائی علماء کی کانفرنس ہوئی اور یہ تجویز منظور کی گئی کہ ہر شخص کو دو بیویوں سے نکاح کر لینے کی عام اجازت ہے'' (اسلامیات، ص۱۱۶، مطبوعہ جامعہ نیو دہلی)۔

عرب جاہلیت میں

غرض دنیا کے مشہور مذاہب میں شاید ہی کوئی مذہب ہو جس نے تعدد ازدواج کو

جائز نہ رکھا ہو، اسلام سے پہلے خود عربوں میں بھی غیر محدود تعدد ازدواج کی اجازت تھی، غیلان ثقفیؓ جب مسلمان ہوئے تو ان کی دس بیویاں تھیں، آپ ﷺ نے ان سے فرمایا کہ چار بیویاں رکھو اور بقیہ کو علاحدہ کردو:

"**أمسک أربعا وفارق سائرهن**" (صحیح ابن حبان، عن ابن عمر، باب نکاح الکفار، حدیث نمبر: ۴۱۵۷)۔

اسی طرح نوفل بن معاویہؓ جب مسلمان ہوئے تو ان کی پانچ بیویاں تھیں، آپ ﷺ نے ان کو ہدایت دی کہ چار بیویاں رکھیں اور باقی کر علاحدہ کردیں' (مفاتیح الغیب: ۴۲/۵، تفسیر سورہ نساء: ۳)، اسی طرح ابوداؤد میں حارث بن قیس سے روایت ہے کہ میں مسلمان ہوا تو میری آٹھ بیویاں تھیں، میں نے رسول اللہ ﷺ سے اس کا ذکر کیا، تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ان میں سے چار کو رکھو اور چار کو چھوڑ دو:

"**اختر منهن أربعا**" (سنن ابی داؤد: باب فی من اسلم وعندہ نساء أکثر من أربع الخ، حدیث نمبر: ۲۲۴۱، عن وہب الأسدی)۔

اسلامی تصور

اسلام نے بھی تعدد ازدواج کی اجازت دی ہے؛ لیکن اس سلسلہ میں تین باتیں قابل توجہ ہیں:

اول یہ کہ اسلام نے صرف اس کی اجازت دی ہے، ترغیب نہیں دی، اس کو جائز تو ٹھہرایا گیا ہے؛ لیکن مستحب قرار نہیں دیا گیا ہے، اگر چہ رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں غزوات اور ان کی وجہ سے بیواؤں اور یتیموں کی کثرت کی بناء پر صحابہ کی بڑی تعداد ایک سے زیادہ بیویاں رکھتے تھے، خود رسول اللہ ﷺ نے اسلام کی دعوت واشاعت اور یتیموں

اور بیواؤں کی کفالت جیسی مصلحتوں کی بناء پر کئی نکاح فرمائے؛لیکن فقہاء اسلام نے اسی بات کو بہتر قرار دیا ہے کہ ایک ہی بیوی پر اکتفا کیا جائے؛چنانچہ علامہ برہان الدین مرغینانی(۵۳۰-۵۹۳ھ)فرماتے ہیں:

''رجل له امرأة فأراد أن يتزوج عليها أخري إن خاف أن لا يعدل بينهما لا يسعه أن يتزوج، وإن علم أن يعدل بينهما فهو فى سعة، وإن لم يفعل ذلک فهو مأجور؛لأنه ترک إدخال الغم علي امرأته، وكذا المرأة إذا أرادت أن يتزوجها على امرأة أخرى، وسعها ذلک وإن تركت تثاب عليه''(مختارات النوازل ۲؍۸۴)۔

(کسی شخص کی ایک بیوی ہواور وہ اس کی موجودگی میں دوسری شادی کرنا چاہےتو اگراس کواندیشہ ہوکہ وہ دونوں کے درمیان عدل نہیں کرسکے گاتو اس کے لئے دوسرا نکاح کرنا جائز نہیں ہے،اور اگر یقین ہو کہ وہ ان کے درمیان عدل کر سکے گا تو اس کے لئے دوسرے نکاح کی گنجائش ہے؛تاہم اگراس کے باوجود دوسرا نکاح نہ کرےتو اجر کا مستحق ہوگا؛اس لئے کہ وہ اپنی بیوی کو رنج واندوہ سے دوچار کرنے سے باز رہاہے،اسی طرح اگر کوئی عورت پہلے سے موجود بیوی کی موجودگی میں دورا نکاح کرنا چاہےتو یہ اس کے لئے جائز ہے؛لیکن اگر وہ ایسا نہ کرےتو اس کو اجر وثواب حاصل ہوگا)۔

اس طرح فتاوی عالمگیری میں ہے:

''وإذا كانت له امرأة وأراد أن يتزوج عليها أخرى، وخاف أن لا يعدل بينهما لا يسعه ذلک، وإن كان لا يخاف وسعه ذلک والإمتنا ع أو لى ويؤجر بترک إدخال الغم عليها''(الہندیہ ۱؍۳۴۱)۔

(کسی کے ایک بیوی موجود ہو، وہ اس کی موجودگی میں دوسری شادی کرنا چاہتا ہو اور اندیشہ ہو کہ ان دونوں کے درمیان عدل نہیں کر سکے گا تو اس کے لئے دوسری شادی کرنا جائز نہیں، اور اگر اس کا اندیشہ نہ ہو تو دوسری شادی کرنے کی گنجائش ہے، لیکن نہ کرنا بہتر ہے اور اگر نہ کرے تو پہلی بیوی کو غم سے دوچار نہ کرنے کا اجر اسے حاصل ہوگا)۔

اسی طرح فقہ حنفی کی ایک اور کتاب میں لکھا ہے:

"**وقالوا: إذا ترک أن يتزوج خوف أن يدخل الغم على زوجته التي كانت عنده كان مأجورا**" (حاشیۃ الشلبی علی تبیین الحقائق ۲/۱۱۲)۔

(فقہاء نے کہا ہے کہ اگر پہلی بیوی کو رنج پہنچنے کے غم سے دوسرا نکاح نہ کرے تو یہ اس کے لئے باعث ثواب ہوگا)۔

یہی نقطہ نظر فقہاء شوافع کا بھی ہے:

"**قال الشافعي: واحب له أن يقتصر على واحدة وإن أبيح له أكثر: لقوله تعالى: فإن خفتم ألا تعدلوا فواحده الخ**" (البیان فی مذہب الامام الشافعی، کتاب النفقات ۱۱/۱۹۰)۔

امام شافعی نے فرمایا: میرے نزدیک مستحب یہ ہے کہ ایک ہی بیوی پر اکتفا کرے مگر یہ کہ ایک سے زیادہ نکاح کرنا جائز ہے، کیونکہ اللہ تعالی نے ارشاد فرمایا کہ اگر تم کو اندیشہ ہو کہ انصاف نہ کر سکو تو ایک ہی بیوی پر اکتفا کرو۔

فقہ شافعی کی ایک اور اہم متداول کتاب میں لکھا گیا ہے:

"**ويحرم على الحرأن يجمع بين اكثر من أربع والأولى الإقتصار على واحدة**" (عمدۃ السالک وعدۃ الناسک ۱/۲۰۵)۔

(آزادمرد کے لئے بیک وقت چار سے زیادہ عورتوں کو جمع کرنا حرام ہے، اور بہتر ہے کہ ایک ہی بیوی پر اکتفا کرے)۔

فقہاء حنابلہ نے بھی یہی لکھا ہے:

"قال المرداوی الحنبلی: ویستحب أیضا: أن لا یزید علی واحدة، إن حصل بها الإعفاف، علی الصحیح من المذهب......قال ابن خطیب التلامیة: جمهور الأصحاب التحبوا أن لا یزید علی احدة" (الانصاف ۱۲/۲۰۴)۔

(علامہ مرداوی حنبلی کہتے ہیں کہ مذہب کا قول صحیح یہی ہے کہ اگر ایک بیوی عفت و پاکدامنی کے لئے کافی ہوجائے تو ایک سے زیادہ نکاح نہ کرے، نیز علامہ ابن خطیب سلانی فرماتے ہیں جمہور حنابلہ نے اسی بات کو بہتر قرار دیا ہے کہ ایک سے زیادہ نکاح نہ کیا جائے)۔

فقہ حنبلی کی ایک اور اہم کتاب کشاف القناع میں لکھا ہے:

"ویستحب أن لا یزیدعلی واحدة إن حصل بها الإعفاف؛ لما فیه من التعرض للمحرم" (کشاف القناع ۱۱/۱۴۸)۔

(اگر ایک بیوی سے پاکدامنی حاصل ہوجائے تو مستحب ہے کہ ایک زیادہ نکاح نہ کیا جائے، اس لئے کہ اس میں اپنے آپ کو حرام (یعنی نا انصافی) کی طرف لے جانا ہے)۔

اسی طرح کی صراحتیں مختلف کتابوں میں منقول ہیں، دیکھئے: (النجم الوہاج فی شرح المنہاج ۷/۱۰، مغنی المحتاج ۴/۲۰۷، شرح المہذب ۱۶/۱۳، التنبیہ فی فقہ الشافعی ۱/۱۸۷ وغیرہ)۔

دوسری بات یہ ہے کہ قرآن مجید نے بیویوں کی تعداع کی توسیع نہیں کی ہے: لیکن اس کو محدود کیا ہے اور زیادہ سے زیادہ چار نکاح کی اجازت دی ہے:

''**فانکحوا ما طاب الکم من النساء مثنی وثلاث ورباع فإن خفتم ألا تعدلوا فواحدة**'' (سورۂ نساء:۳)۔

(تمہیں جو عورتیں پسند ہوں، ان میں سے دو دو، تین تین، چار چار سے نکاح تو کر ہی سکتے ہو اور اگر اندیشہ ہو کہ عدل نہیں کر سکو گے تو پھر ایک ہی پر اکتفا کرو)۔

غرض کہ ایک وقت میں چار سے زیادہ بیویاں رکھنے کی گنجائش نہیں ہے۔

تیسرے: یہ اجازت عدل کے ساتھ مشروط ہے، یعنی جو شخص ایک سے زیادہ بیویوں کے درمیان حقوق کی ادائیگی اور سلوک و برتاؤ میں برابری کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو، اسی کے لئے ایک سے زیادہ نکاح کی اجازت ہے؛ چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد گزر چکا ہے:

''**فإن خفتم ألا تعدلوا فواحدة**'' (نساء:۳)۔

(اور اگر اندیشہ ہو کہ عدل نہیں کر سکو گے تو پھر ایک ہی پر اکتفاء کرو)۔

جو شخص دو بیویوں کے درمیان عدل نہ کرے، اس کے لئے بڑی وعید ہے، رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

''**إذا كانت عند الرجل امرأتان فلم يعدل بينهما جاء يوم القيامة وشقه ساقط**'' (المستدرک للحاکم، کتاب النکاح، حدیث نمبر ۲۷۵۹)۔

(اگر آدمی کے پاس دو بیویاں ہوں اور وہ ان کے درمیان عدل نہ کرے تو وہ قیامت کے دن اس حال میں آئے گا کہ ایک پہلو جھکا ہوا (یعنی مفلوج) ہوگا)۔

چنانچہ فقہاء نے صراحت کیا ہے کہ اگر انصاف قائم کرنے کی امید نہ ہو تو دوسرا

نکاح کرنا جائز نہیں، اوپر ایک ہی بیوی پر اکتفاء کرنے کے سلسلہ میں فقہاء کی جو صراحتیں گزری ہیں، ان سب میں جہاں ایک نکاح کو مستحب قرار دیا گیا ہے، وہیں یہ بات بھی کہی گئی ہے کہ یہ حکم اس شخص کے حق میں ہے جس کو امید ہو کہ اگر اس نے دوسرا نکاح کیا تو دونوں کے درمیان برابری کا سلوک کر سکے گا، جس کو یہ امید نہیں ہو اس کے لئے دوسرا نکاح کرنا جائز نہیں، نیز اگر کسی شخص کی ایک سے زیادہ بیویاں ہوں اور وہ ان دونوں کے درمیان عدل سے کام نہ لے تو جس کے ساتھ ناانصافی کی جائے، وہ عدالت سے برابری کے سلوک کا بھی مطالبہ کر سکتی ہے اور اگر شوہر کے ساتھ نہیں رہنا چاہتی ہو تو فسخ نکاح کا بھی دعوی کر سکتی ہے۔

سماجی ضرورت

دوسرا پہلو سماجی ضرورت کا ہے، عام طور پر لڑکوں اور لڑکیوں کی شرح پیدائش میں کوئی زیادہ فرق نہیں ہوتا؛ لیکن شرح اموات میں مردوں کی تعداد زیادہ ہو جاتی ہے؛ کیونکہ زیادہ تر حادثات میں مردوں کی ہی جانیں کام میں آتی ہیں، مثلاً پہلی جنگ عظیم جو ۲۸ / جولائی ۱۹۱۴ء سے ۱۱ نومبر ۱۹۱۸ء تک جاری رہی، میں ایک کڑوڑ ۸ / لاکھ، ۲۴ / ہزار، ۲۳۶ کے قریب تو صرف فوجی مارے گئے، اور ۲ کروڑ، ۳۶ / لاکھ، ۶۵ / ہزار، ۸۷۳ زخمی ہوئے، شہریوں کی تعداد اس کے علاوہ ہے (اوکی پیڈیا، ورلڈ وار-۱)، ظاہر ہے کہ یہ فوجی مرد تھے، دوسری جنگ عظیم ۱۹۳۹ء تا ۱۹۴۵ء جاری رہی، جس میں کل ساڑھے آٹھ کروڑ آدمی ہلاک ہو گئے، معذور ہونے والے ان کے علاوہ ہیں، ان مہلوکین اور معذورین میں غالب ترین اکثریت مردوں کی تھی، ان جنگوں میں برباد ہونے والا قائد ملک جرمنی تھا، چنانچہ اس کے بعد عرصہ تک جرمنی میں یہ کیفیت تھی کہ ہر مرد کے

مقابلہ شادی کی عمر کو پہنچی ہوئی تین عورتیں ہوتی تھیں، فرانس میں ۱۹۰۰ء کی مردم شماری کے اعتبار سے عورتوں کی تعداد مردوں سے چار لاکھ، تیئیس ہزار، سات سو نوز یادہ تھی، اور آسٹریا میں ۱۸۹۰ء میں چھ لاکھ، چوالیس ہزار، سات سو، چھیانوے عورتیں مردوں سے زیادہ تھیں، عراق ایران جنگ (۱۹۸۸-۱۹۷۹ء) میں عراق کی ایک لاکھ اور ایران کی بیاسی ہزار عورتیں بیوہ ہوگئیں، اور اب تک عراق کی بدقسمت مہلوکین کی تعداد ۱۰/لاکھ کے قریب پہنچ چکی ہے، بڑی طاقتوں نے ایک سازش کے طور پر شام پر جو جنگ مسلط کی ہے، اس میں بھی اب تک ۵/لاکھ لوگوں کی جانیں جا چکی ہیں۔

جنگوں کے علاوہ جو دوسرے ٹریفک یا صنعتی حادثات پیش آتے ہیں اور جو لوگ ہلاک ہوتے ہیں، وہ بھی عام طور پر مرد ہی ہوتے ہیں

مثلاً امریکہ میں ٹریفک نظام کے استحکام اور لوگوں میں نسبتاً زیادہ شعور پائے جانے کی وجہ سے ٹریفک حادثات کم ہوتے ہیں، لیکن وہاں گذشتہ پانچ سال کے ٹریفک حادثات میں مرنے والے مردوں اور عورتوں کی تعداد اس طرح ہے:

2011 مرد:	22,937	عورت:9534
2012 مرد:	23,961	عورت:9809
2013: مرد:	23,243	عورت:9638
2014: مرد	23,266:	عورت:9463
2015 مرد:	24,899	عورت:10166

(Source:US Department of Transportations Fatality Analysis Posted System)

پھر اگر جیلوں میں قیدیوں کا جائزہ لیا جائے تو ان میں بڑی تعداد مردوں کی ہوتی ہےمثلا ہندوستان میں 2015 میں وزارت امور داخلہ کی اطلاع کے مطابق کل چار لاکھ انیس ہزار چھ سوتیس قیدی تھے، جن کا تناسب مجموعی اعتبار سے 33% (فی ایک لاکھ) ہوتا ہے، ان قیدیوں میں خواتین 4.3% تھی اور بقیہ مرد تھے۔

بالخصوص طویل المدت قیدیوں کی بڑی تعداد مردوں پر مشتمل ہوتی ہے(United Nation Figures) کیونکہ طویل قید بھیانک جرائم پر ہوتی ہے، اور اپنی نفسیاتی کمزوری کی بنا پر مجرم ذہن کی عورتیں بھی بھیانک قسم کے جرائم کا حوصلہ نہیں پاتیں، ان اسباب کی بناء پر عام طور پر ایک مرد کے مقابلہ ایک سے زیادہ عورتوں کا تناسب پایا جاتا ہے، امریکہ جیسے ملک میں جس میں حادثات سے حفاظت کا زیادہ ترقی یافتہ نظام قائم ہے، اور دفاعی ٹکنالوجی میں ترقی اور بالادستی کی وجہ سے حریف ملکوں کے مقابلہ میں اس کی فوجیوں کی ہلاکت کا تناسب بھی بہت کم ہوتا ہے، ایک رپورٹ کے مطابق ۱۹۸۷ء میں وہاں عورتوں کی آبادی بمقابلہ مردوں کے تقریبا اسی لاکھ زیادہ تھی۔

اسی طرح مختلف ممالک میں مردوں اور عورتوں کی تعداد میں فرق واقع ہوتا رہا ہے اور اکثر اوقات عورتوں کی تعداد زیادہ ہوجاتی ہے، مثال کے طور پر درج ذیل نقشہ کو ملاحظہ کیا جاسکتا ہے:

ملک	مرد	عورت
آسٹریا	47.07	52.93
برما	48.81	51.19
جرمنی	48.02	51.89

فرانس	48.99	51.501
اٹلی	48.89	51.11
پولینڈ	48.61	51.39
اسپین	48.94	51.06
سوئز رلینڈ	48.67	51.33
سوویت یونین	46.59	53.03
برطانیہ	48.58	51.42

(انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا، بہ حوالہ: خاتون اسلام، تالیف: مولانا وحید الدین خان ص ۲۷۴)

اس میں شبہ نہیں کہ بعض ممالک میں آبادی کا تناسب اس کے برعکس بھی ہوتا ہے، مگر ظاہر ہے کہ وہاں از خود لوگ یک زدجگی پر مجبور ہوں گے اور تعدد ازدواج کی نوبت کم سے کم پیش آئے گی؛ لیکن عورتوں کی شرح آبادی بڑھی ہوئی ہو اور وہاں اگر تعدد ازدواج کی اجازت نہ دی جائے تو اس کا مطلب یہی ہوگا کہ خواتین کی ایک بڑی تعداد تجرد اور محرومی کی زندگی گذارے؛ اس لئے تعدد ازدواج مردوں کی ہوس اور نفسانی طمع کی تکمیل نہیں، بلکہ ایک سماجی ضرورت ہے۔

اخلاقی پہلو

تعدد ازدواج کے مسئلہ میں سب سے اہم پہلو اخلاقی ہے، عفت وعصمت انسانیت کا بنیادی جوہر ہے، گائے اور بیل، گھوڑے، گدھے اور ان کی مادہ کے درمیان کیا کبھی نکاح ہوا ہے؟ ظاہر ہے اس کا جواب نفی میں ہے، نر و مادہ کی تقسیم اور جنسی خواہش انسان میں بھی ہے اور دوسرے حیوانات میں بھی؛ لیکن یہ انسانی سماج کا امتیاز ہے کہ نکاح

کے ذریعہ ایک مرد اور عورت رشتہ ازدواج میں بندھ جاتے ہیں، اور ان کی وفاداریاں ایک دوسرے کے لئے محدود و مخصوص ہو جاتی ہیں، دوسری مخلوقات اس وفاداری سے ناآشنا ہیں، اسی وفادی کا نام ''عفت و عصمت'' ہے، عفت و عصمت انسان کی فطرت میں ہے اور ہر سلیم الفطرت شخص اس کا ادراک کرسکتا ہے، یہی وجہ ہے کہ انسان اپنی ماں، بہن، بیوی اور بیٹی کے بارے میں برائی کی نسبت کو برداشت نہیں کرسکتا، تعدد ازدواج اس جوہر عفت کی حفاظت کا بہت بڑا ذریعہ ہے، دنیا کی تاریخ میں جب کبھی بھی قانونی تعدد ازدواج پر روک لگائی گئی ہے، وہاں غیر قانونی تعدد ازدواج نے ضرور راہ پائی ہے، قدیم تہذیبوں میں یونانی اور رومی تہذیب تعدد ازدواج کی مخالف تھی، ایڈور ڈہارٹ پول لیکی (۱۸۳۸-۱۹۰۳ء) نے یونانی تہذیب کے بارے میں لکھا ہے کہ مرد کے لئے ایک زیادہ نکاح کی اجازت نہ تھی، لیکن غیر قانونی داشتاؤں پر کوئی روک ٹوک بھی نہیں تھی (تاریخ اخلاق یورپ رص ۲۴۰، ترجمہ دریابادی)۔

چنانچہ مصنف مزاج غیر مسلم دانشوروں نے بھی اس حقیقت کا اعتراف کیا ہے، علم تمدن کے معروف عالم ڈاکٹر گستاؤلی بان لکھتے ہیں:

''مغرب میں بھی ایک ہی شادی کی رسم کا وجود صرف کتابوں ہی میں ہے اور میں خیال کرتا ہوں کہ کوئی شخص انکار نہ کرے گا کہ یہ رسم ہماری واقعی معاشرت میں نہیں پائی جاتی ہے، میں نہیں جانتا کہ مشرقیوں کا جائز تعدد کسی امر میں مغربیوں کے ناجائز تعدد ازدواج سے کمتر سمجھا جاتا ہے؟ بلکہ میں یہ کہوں گا کہ اول کو ہر طرح دوسرے پر ترجیح ہے'' (تمدن عرب: ۳۶۶)۔

جناب مالک رام، ملک کے حقیقت پسند اصحاب دانش میں تھے، ان کا یہ اقتباس

پڑھنے کے لائق ہے:

’’تعدادِ ازدواج کی تائید میں متعدد دلائل پیش کیئے جاسکتے ہیں، مثلاً یہ عام حالت میں دنیا میں عورتوں کی تعداد مردوں سے کہیں زیادہ ہے، اگر ایک مرد، ایک عورت کے اصول پر عمل کیا جائے تو ان زائد عورتوں کا کیا بنے گا؟ کیا ہم ان پر نکاح کا راستہ بند کر کے ان کی اور ان کے ساتھ شادی شدہ مردوں کی بھی گمراہی کا سامان تو پیدا نہیں کر رہے ہیں......اگر آپ ان عورتوں کو نکاح کرنے کا موقع نہیں دیتے تو گویا انہیں قعرِ مذلت میں ڈھکیل رہے ہیں اور انہیں مجبور کر رہے ہیں کہ وہ گناہ کی زندگی بسر کریں؛ کیونکہ یہ جذبہ فطری ہے، اگر عورت سماج کی اجازت سے اس کی تسکین نہیں کر سکے گی تو سماج کو دھتا بتائے گی اور گھونگھٹ کی اوٹ میں شکار کھیلے گی، اس صورت میں آپ کو کسی اور حرام اولاد کا وجود قانوناً تسلیم کرنا پڑے گا، حقِ انتخاب آپ کو حاصل ہے، ایک طرف آپ اس عورت کو قابلِ عزت بیوی اور گھر کی مالکہ اور محترم ماں بنانے پر قادر ہیں، دوسری صورت میں وہ قابلِ نفرت داشتہ یا کسی خانماں برباد اور اپنے اور تمام سماج کے لئے کلنک کا ٹیکا بننے پر مجبور ہے‘‘ (اسلامیات: ۱۶۲، ۱۶۱)۔

پس حقیقت یہ ہے کہ تعدادِ ازدواج کی گنجائش ایک عفیف و پاک دامن سماج کے لئے ضرورت کے درجہ میں ہے، اور یہ کوئی نظری فلسفہ نہیں؛ بلکہ مغرب کا عصمت باختہ سماج اس کی عملی مثال ہے!

اس کا اندازہ مغربی ملکوں میں غیر ثابت النسب بچوں کی سال بسال بڑھتی ہوئی تعداد سے لگایا جاسکتا ہے، جو 2014 کی رپورٹ ہے:

بلغاریہ	:	58,8

بیلجیم	:	52,3
چیک ریپبلک	:	46,7
اسپین	:	42,5
لاطویہ	:	44,00
سلووینیہ	:	58,3
سویڈن	:	54,6
برطانیہ	:	47,5
ناروے	:	55,5

(Source: Eurostal Conline Data Code: Demo-Find)

عورتوں کے لئے رحمت نہ کہ زحمت

تعدد ازدواج میں ایک پہلو عورت کے ساتھ رحمدلی کا بھی ہے، اگر ایک عورت دائم المریض ہو، صاحب اولاد نہ ہونے کے سبب یا کسی اور مناسب یا مناسب وجہ سے مرد دوسرے نکاح پر مصر ہوتو اگر تعدد ازدواج کی گنجائش نہ رکھی جائے تو یا تو وہ اسے طلاق دے دے گا، جس کا مذموم ہونا ظاہر ہے، یا وہ غیر قانونی تعدد ازدواج کا راستہ اختیار کرے گا، اور غیر قانونی بیوی قانونی بیوی سے زیادہ نقصان دہ ہوتی ہے؛ کیونکہ وہ مرد کو زیادہ بلیک میل کر سکتی ہے، اور اپنے خنجر ناز سے قانونی بیوی کو گھائل کرنے کی زیادہ صلاحیت رکھتی ہے، ایسی صورتوں میں تعدد ازدواج رحمت ثابت ہوتی ہے نہ کہ زحمت، مطلقہ اور بیوہ خواتین کے مسائل کا حل اکثر یہی تعدد ازدواج بنتا ہے، اور یہ تعدد ازدواج بھی دوسری بیوی کی رضامندی اور خوشنودی ہی سے وجود میں آتا ہے؛ کیونکہ کسی عورت کو دوسری بیوی بننے پر

مجبور نہیں کیا جا سکتا- خود عورتوں کو بھی اس بات کو سمجھنا چاہئے کہ جب عورتوں کی شرح آبادی مجموعی طور پر مردوں سے زیادہ ہے تو وہ بحیثیت عورت اپنی ان بہنوں کے لئے قانونی طور پر رشتہ نکاح میں منسلک ہونا پسند کریں گی یا یہ بات کہ وہ وقتاً فوقتاً مختلف مردوں کی غیر قانونی بیوی بنتی رہیں اور ان حقوق وفوائد سے بھی محروم رہیں، جو ایک بیوی کو اپنے شوہر سے حاصل ہونے چاہئیں؟

ہندوستانی مسلمان اور تعدد ازدواج

ہندوستان میں عام طور پر یہ تاثر پایا جاتا ہے کہ مسلمانوں میں تعدد ازدواج کا رواج زیادہ ہے، فرقہ پرست جماعتیں اس کا خاص طور پر پروپگنڈہ کرتی ہیں اور اکثریتی فرقہ کو اس سے ڈراتی ہیں، مگر حقیقت اس کے برخلاف ہے، ڈاکٹر شائستہ پروین نے ''ہندوستانی معاشرہ میں تعدد ازدواج'' کے موضوع پر اپنا پی ایچ ڈی کا مقالہ لکھا ہے، انہوں نے اس سلسلہ میں مختلف سروے رپورٹیں جمع کی ہیں، جن میں مختلف قوموں میں تعدد ازدواج کا تناسب واضح کیا گیا ہے، اس کا خلاصل یہاں درج کیا جاتا ہے:

ا	1931-40	1941-50	1951-60
قبائلی	9.35	17.53	17.98
ہندو	6.79	7.15	5.06
مسلمان	7.29	7.06	4.31

۲-1961 کاایک اور سروے:

قبائلی	:	15.25
بدھسٹ	:	7.97
جین	:	6.72
ہندو	:	5.08
مسلمان	:	5.07

۳-1961 سمنتا بنرجی کی سروے رپورٹ:

قبائلی	:	15.25
ہندو	:	5.06
مسلمان	:	4.31

۴-1991 ورلڈ ڈیولپمنٹ رپورٹ:

قبائلی	:	15.25
بودھ	:	7.97
ہندو	:	5.80
مسلمان	:	5.73

۵-تمل ناڈو1984:

ہندو	:	5.05
مسلمان	:	4.2

ان کے علاوہ بعض اور سروے رپورٹوں کے لئے مذکورہ کتاب ''ہندوستانی

معاشرہ میں تعدد ازدواج'' دیکھی جاسکتی ہے، ان سبھوں سے مشترک طور پر جو بات معلوم ہوتی ہے، وہ یہ ہے کہ ہندوستان میں تعدد ازدواج کا سب سے کم تناسب مسلمانوں میں ہے۔

خلاصہ گفتگو

اس لئے حقیقت یہ ہے کہ تعدد ازدواج کی اجازت ایک سماجی وعمرانی ضرورت اور عفت و پاک دامنی کی حفاظت کا ذریعہ ہے، اوراپنے نتائج واثرات کے اعتبار سے خود عورتوں کے لئے بعض حالات میں باعث رحمت ہے؛ البتہ یہ بات ضروری ہے کہ تعدد ازدواج کے لئے شریعت نے جو حدود و قیود مقرر کی ہیں، ان کا لحاظ رکھا جائے، ورنہ یہ حکم شریعت کا استعمال نہیں؛ بلکہ ''استحصال'' ہوگا۔

☆☆☆

طلاق، اسلامی نقطہ نظر

شریعت کی نگاہ میں نکاح ایک پاکیزہ، ٹھوس اور پائیدار رشتہ ہے، اسلام چاہتا ہے کہ جن مرد وعورت نے نکاح کی صورت میں ایک ساتھ زندگی بسر کرنے اور ایک دوسرے کا ساتھی بن کر رہنے کا عہد کیا ہے، وہ ہمیشہ اس پر قائم رہیں اور معمولی معمولی باتوں اور زندگی کی چھوٹی چھوٹی الجھنوں کی وجہ سے اس رشتہ کی مضبوط بنیادوں کو ڈھا نہ دیں۔

قرآن مجید نے میاں بیوی کے رشتہ کو ایک دوسرے کے لئے ذریعہ سکون بتایا ہے (روم:۲۱)، اور ایک کو دوسرے کے لئے لباس قرار دیا ہے کہ جس طرح لباس انسانی جسم کا سب سے بڑا ہمراز، تکلیف وآرام کا ساتھی اور محافظ ہے، اسی طرح میاں بیوی ایک دوسرے کے رازداں، ان کی باہمی کمزوریوں پر پردہ ڈالنے والے اور ہر حال میں ان کے ساتھی اور رفیق ہیں۔

اسلام کی نگاہ میں اس رشتہ کو بڑی عظمت حاصل ہے؛ اس لئے کہ یہ مرد وعورت دونوں کے لئے عفت وپاکدامنی کا باعث بنتا ہے، دو اجنبی خاندان ایک دوسرے کے قریب آتے ہیں اور ان کے درمیان محبت والفت پیدا ہوتی ہے، نیز یہی تعلق نسل انسانی کی افزائش کا ذریعہ بھی بنتا ہے۔

پھر اگر خدانخواستہ رشتہ ٹوٹتا تو اتنی ہی مضرتیں اپنے ساتھ لاتا ہے، دو آدمی کی

زندگیاں ویران ہوجاتی ہیں، بال بچوں کو باپ کی شفقت یا ماں کی ممتا میں سے کسی ایک سے محروم ہونا پڑتا ہے، ان کی پرورش اور تعلیم وتربیت صحیح طور پر نہیں ہو پاتی، دو خاندان جس قدر ایک دوسرے سے قریب ہوئے تھے، اب اتنا ہی دور ہوجاتے ہیں اور آپس میں سخت نفرت اور کدورت پیدا ہوجاتی ہے؛ اس لئے اسلام ابتدا ہی میں ایسے تمام دروازوں کو بند کرنے کی کوشش کرتا ہے، جو بعد میں باہمی نفرت، اختلاف اور ایک دوسرے سے دوری اور علاحدگی کا سبب بن سکتے ہیں۔

اسی لئے نکاح میں خود لڑکے اور لڑکی کی رضامندی کو ضروری قرار دیا گیا ہے، اگر ان دونوں میں سے کسی ایک رشتہ ناپسند ہو تو اگرچہ ان کے سرپرستوں کو یہ رشتہ مرغوب ہو پھر بھی عاقدین کو اس کے قبول کرنے پر مجبور نہیں کیا جاسکتا، رسول اللہ ﷺ کے پاس ایک ایسی لڑکی کا معاملہ آیا، جس کے والد نے اس کی ناپسندیدگی کے باوجود رشتہ کردیا تھا، آپ ﷺ نے اس نکاح کو ردفرمادیا (صحیح بخاری، باب فی النکاح، حدیث نمبر ۶۹۶۹)، بلکہ اس رشتہ کے استحکام کے لئے اسلام نے بعض ایسی باتوں کو بھی گوارہ کیا ہے، جو اسلام کی عمومی تعلیمات سے ہم آہنگ نہیں ہیں، مثلاً پردہ کی اسلام میں کس قدر اہمیت ہے؟ وہ سب پر واضح ہے؛ لیکن منگیتر کو دیکھنے کی نہ صرف یہ کہ اجازت دی گئی ہے؛ بلکہ اسے بہتر قرار دیا گیا ہے، یہاں تک کہ فقہاء نے لکھا ہے کہ شہوت اور بدنگاہی کا اندیشہ ہو تو بھی مرد ایسی لڑکی کو دیکھ سکتا ہے، جس سے نکاح کا ارادہ ہو (عالمگیری ۵/۳۲۷، کتاب الکراہیۃ)، اسی طرح باوجود اس کے کہ اسلام انسانی مساوات اور برابری کا قائل ہے اور اس کے نزدیک برتری اور کمتری صرف تقوی کی بناء پر ہے؛ لیکن چونکہ بسا اوقات خاندانی اور معاشی کفاءت یا پیشہ ورانہ برتری اور کمتری میاں بیوی کے درمیان کھینچاؤ اور نفرت کی بنیاد بن جاتا ہے؛ اس لئے شریعت نے

اس کی بھی اجازت دی ہے کہ نکاح کرتے وقت اس کا لحاظ رکھا جائے، اسی کو فقہ کی اصطلاح میں ''کفاءت'' کہتے ہیں۔

طلاق ایک ناپسندیدہ عمل

طلاق چونکہ اسی رشتہ کو توڑنے کا نام ہے؛ اس لئے طلاق اسلام میں ایک نہایت ناپسندیدہ عمل ہے، اورطلاق کے بارے میں شریعت کا بنیادی نقطہ نظر یہ ہے کہ یہ بلاضرورت محظور یعنی ممنوع ہے، اس سلسلہ میں چند اہم فقہی تصریحات نقل کی جاتی ہیں:

☆ مشہور حنفی فقیہ علامہ علاء الدین کاسانی (م: ۵۸۷) فرماتے ہیں:

''**إن النكاح عقد مسنون فكان الطلاق قطعا للسنة وتفويتا للواجب، فكان الأصل الحظر والكراهة إلا أنه رخص للتأديب أو للتخليص**'' (بدائع الصنائع ۳/ ۹۰) (نکاح مسنون عقد ہے، طلاق اس سنت کو ختم کرنے اور واجب کو فوت کرنے کا سبب ہے؛ لہذا اصلاً یہ ممنوع اور ناپسندیدہ ہے۔

☆ فقہ حنفی کے مسائل کا مشہور مجموعہ جس کو ہندوستان کے ممتاز علماء نے اورنگ زیب عالمگیرؒ کے حکم پر مرتب کیا تھا اور جس کو ہندوستان کی طرف منسوب کرتے ہوئے ''فتاوی ہندیہ'' کہتے ہیں، میں ہے:

''**وأما وصفه (الطلاق) فهو أنه محظور نظراً إلى الأصل ومباح نظرا إلى الحاجة**'' (الفتاوی الہندیہ ۱/ ۳۴۸ کتاب الطلاق، الباب الأول) (طلاق اصل کے اعتبار سے ممنوع اور ضرورت کی بناء پر جائز ہے)۔

☆ ماضی قریب کے مشہور حنفی فقیہ علامہ ابن عابدین شامیؒ فرماتے ہیں:

''**وأما الطلاق فإن الأصل فيه الحظر إلا لعارض يبيحه**''

(ردالمحتار ۳/ ۳۳۸، کتاب الطلاق) (طلاق میں اصل ممنوع ہونا ہے؛ سوائے اس کے کہ کوئی ایسا عارض درپیش ہو، جو اس کے جائز ہونے کا تقاضا کرتا ہو)۔

☆مشہور شافعی فقیہ امام الحرمینؒ فرماتے ہیں:

"إيقاع الطلاق فی الأصل مكروه من غير حاجة"(نہایۃ المطلب ۱۴/ ۱۱ فقرہ نمبر ۸۹۲۶)۔

(بنیادی طور پر بلاضرورت طلاق واقع کرنا مکروہ ہے)۔

☆فقہ شافعی کی معروف ومعتبر کتاب ''مغنی المحتاج'' میں طلاق کا حکم بیان کرتے ہوئے کہا گیا ہے:

''ومكروه (الطلاق) زوجة مستقيمة الحال''(مغنی المحتاج ۴/ ۴۹۷، فصل فی الطلاق السنی وغیرہ، کتاب الطلاق)۔

(اور بعض حالات میں طلاق دینا مکروہ ہے، جیسے ایسی بیوی کو طلاق دینا جس کا رویہ درست ہو)۔

☆شیخ منصور بن ادریس حنبلی (متوفی: ۱۰۵۱ء) فرماتے ہیں:

''يباح الطلاق عند الحاجة إليه، ويكره الطلاق من غير حاجة''(کشاف القناع ۳/ ۳۱۹ طبع مطبعۃ شرقیۃ، مصر)۔

(ضرورت کے وقت طلاق دینا جائز ہے اور بلاضرورت مکروہ ہے)۔

☆مشہور عالم علامہ ابن تیمیہ (متوفی ۷۲۸ھ) فرماتے ہیں:

''إن الأصل فی الطلاق الحظر وإنما أبيح منه قدر الحاجة''(مجموع الفتاوی: ۳۲/ ۲۹۳ ا سئل عن الخلع، ہل ہو طلاق محسوب من الثلاث؟)۔

(اصل کے اعتبار سے طلاق ممنوع ہے؛ البتہ ضرورت کے بقدر اس کی اجازت

دی گئی ہے)۔

غرض کہ شریعت میں ایک سماجی ضرورت کے طور پر طلاق کی گنجائش رکھی گئی ہے؛ لیکن اصلا یہ ممنوع ہے، جب ازدواجی رشتہ کو قائم رکھنا دشوار ہوجائے اور نکاح کے مقاصد فوت ہوجائیں تب ہی اس کی اجازت دی گئی ہے، اگر کسی معقول سبب کے بغیر طلاق دی گئی تو طلاق واقع ہوجائے گی؛ لیکن طلاق دینے والے مرد یا بلا وجہ طلاق کا مطالبہ کرنے والی عورتیں گنہگار رہوں گی۔

دلائل

طلاق کے اصلا ممنوع ہونے اور ضرورت کی بناء پر جائز ہونے کی چند دلیلیں یہ ہیں:

۱-"**فإن أطعنكم فلا تبغوا عليهن سبيلا**"(نساء:۴/ ۳۴)۔

(پھر اگر بیویاں (جائز باتوں میں) تمہاری فرمانبردار ہوجائیں تو ان کے خلاف کوئی راستہ تلاش نہ کرو (یعنی ان کو خواہ مخواہ طلاق مت دو)۔

۲-حضرت محارب بن دثارؒ سے مروی ہے:"**ما أحل الله شيئا أبغض إليه من الطلاق**"(سنن ابوداؤد، باب کراہیۃ الطلاق ۱/ ۵۲۶، حدیث نمبر:۲۱۷۹)۔

(اللہ تعالی نے جن چیزوں کی اجازت دی ہے، اس میں اللہ کے نزدیک طلاق سے زیادہ ناپسندیدہ کوئی عمل نہیں ہے)۔

یہی بات حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے رسول اللہ ﷺ سے ان الفاظ میں نقل کی ہے:

۳-"**أبغض الحلال إلى الله الطلاق**"(سنن ابن ماجہ، کتاب الطلاق ۱/ ۶۵۰، حدیث نمبر:۲۱۷۹)۔

(اللہ کے نزدیک حلال چیزوں میں سب سے زیادہ ناپسندیدہ طلاق ہے)۔

۴-رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''**إن الله لا يحب كل ذواق من الرجال، ولا كل ذواقة من النساء**'' (مصنف ابن ابی شیبۃ عن شہر بن حوشب ۱۰/۱۸۹، حدیث نمبر: ۱۹۵۳۶)۔

(اللہ تعالیٰ کی لعنت ہو ہر مزا چکھنے والے مرد اور ہر مزا چکھنے والی عورت پر)۔

۵-آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''**أيما امرأة اختلعت من زوجها بغير نشوز فعليها لعنة الله والملائكة والناس أجمعين**'' (مرقاۃ المفاتیح، شرح مشکاۃ المصابیح ۵/۲۱۳۷، بہ ضمن حدیث نمبر: ۳۲۸۰)۔

(جو عورت نافرمانی کرتے ہوئے اپنے شوہر سے خلع طلب کرے تو اس پر اللہ کی، تمام فرشتوں کی اور لوگوں کی لعنت ہو)۔

اسی مضمون کی ایک اور روایت میں آپ ﷺ کا ارشاد منقول ہے:

''**أيما امرأة سألت زوجها الطلاق من غير ما بأس فحرام عليها رائحة الجنة**'' (سنن ابن ماجہ، عن ثوبان: ۱/۶۶۲، حدیث نمبر: ۲۰۵۵، باب کراہیۃ الخلع للمرأۃ)۔

(جو عورت بلا وجہ اپنے شوہر سے طلاق کا مطالبہ کرے، وہ جنت کی خوشبو سے بھی محروم رہے گی)۔

۶-اللہ تعالیٰ نے نکاح کو ایک نعمت قرار دیا ہے:

''**ومن آياته أن خلق لكم من أنفسكم أزواجا**'' (سورۂ روم: ۲۱)۔

(اور اللہ کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ اس نے تمہارے لئے تم ہی میں سے جوڑا پیدا کیا ہے)۔

طلاق کے ذریعہ نکاح کو ختم کرنا اللہ کی اس نعمت کے ساتھ ناشکری ہے؛ لہٰذا طلاق بہ وقت ضرورت ہی جائز ہوگی (المبسوط للسرخسی ۶/۲، کتاب الطلاق)۔

۷ -طلاق عاقدین کے لئے نقصان کا سبب ہوتا ہے، شوہر کے لئے بھی اور بیوی کے لئے بھی، اور رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

”**لا ضرر ولا ضرار**“ (ابن ماجہ: عن ابن عباسؓ، حدیث نمبر: ۲۵۴۱، باب من بنی فی حقہ ما یضر بجارہ)۔

ایک غلط فہمی کا ازالہ

طلاق کے لئے جو فقہاء نے طلاق سنت، طلاق سنی، طلاق احسن اور طلاق حسن کی اصطلاحات استعمال کی ہیں، اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ طلاق دینا مسنون ہے، یا طلاق دینا بہتر ہے، یہ الفاظ طلاق کے حکم کے اعتبار سے استعمال نہیں کئے گئے، بلکہ طریقہ استعمال کے لحاظ سے یہ اصطلاحات مقرر کی گئی ہیں، جس طریقہ پر طلاق دینے کی اجازت ہے، اس کو طلاق سنت کہا گیا ہے اور اس کی قسمیں طلاق احسن اور طلاق حسن قرار دی گئی ہیں، اور طلاق دینے کا جو طریقہ غلط اور نادرست ہے، اس کو طلاق بدعت کہا گیا؛ اس سے یہ غلط فہمی نہیں ہونی چاہئے کہ اسلام میں طلاق دینا مسنون یا بہتر فعل ہے۔

مگر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ کبھی کبھی طلاق ایک ضرورت اور مجبوری بن جاتی ہے، کسی وجہ سے زندگی کی راہ پر ان دونوں کا ایک ساتھ چلنا ممکن نہیں ہوتا اور حالات کچھ ایسے ہوجاتے ہیں کہ ایک دوسرے سے جدا اور علاحدہ رہ کر زندگی بسر کرنے ہی میں دونوں کے لئے سکون وچین اور اطمینان کا سامان ہوتا ہے، ان حالات میں شریعت ایک ناپسندیدہ ضرورت کے طور پر اس کی اجازت دیتی ہے۔

طلاق کی گنجائش کیوں؟

یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ بعض چیزیں ہوتی تو ہیں ناگوار اور ناپسندیدہ؛ لیکن بعض

حالات میں ضروری بھی ہو جاتی ہیں، جیسے بیت الخلاء کوئی اچھی جگہ نہیں ہوتی اور کوئی سمجھ دار آدمی اس جگہ زیادہ دیر رہنا پسند نہیں کرتا؛ لیکن وہ گھر مکمل نہیں ہوسکتا جس میں بیت الخلاء موجود نہ ہو، جسم میں نشتر لگانا ایک تکلیف دہ عمل ہوتا ہے؛ لیکن وہ معالج ایک مکمل معالج کہلانے کا مستحق نہیں، جو بوقت ضرورت آپریشن کرنے پر قادر نہ ہو، طلاق ایک ایسا ہی ناخوشگوار اور ناپسندیدہ عمل ہے؛ لیکن ازدواجی زندگی کا وہ قانون مکمل کہلانے کا مستحق نہیں، جس میں رشتہ نکاح کے بندھن کو کھولنے کی گنجائش نہیں رکھی گئی ہو۔

طلاق کی گنجائش نہ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ میاں بیوی ایک دوسرے سے کتنی ہی نفرت رکھتے ہوں، اور بے اطمینانی کی زندگی گزارتے ہوں؛ لیکن نہ شوہر کے لئے ممکن ہے کہ وہ اپنی بیوی سے ترک تعلق کر کے ذہنی سکون حاصل کرے، اور نہ بیوی کے لئے کوئی راستہ ہے کہ وہ اپنے شوہر سے آزادی حاصل کرے، یہ بہ ہرصورت نفرت کی آگ میں جلتے اور بے سکونی کی کروٹ لیتے ہوئے اپنی زندگی گزاریں، یہ یقیناً ایک غیر فطری بات ہے اور انسان فطرت سے بغاوت کر کے پرسکون زندگی نہیں گزار سکتا؛ اسی لئے دنیا کے دو ایسے مذاہب-جن کے ماننے والوں کی بڑی تعداد ہے-کو اپنا رویہ بدلنا پڑا اور طلاق کی گنجائش پیدا کرنی پڑی، ایک: ہندو مذہب، ہندو شاستر میں طلاق کی کوئی گنجائش نہیں رکھی گئی ہے، اور موت کے سوا، کوئی اور چیز اس رشتہ کو توڑ نہیں سکتی؛ لیکن آخر ہندوستان میں ہندوؤں کے لئے طلاق کی گنجائش پیدا کی گئی، اور اس وقت ہندو بھائیوں کے یہاں طلاق کا فیصد مسلمانوں سے بھی بڑھا ہوا ہے، دوسرا مذہب عیسائیت ہے، انجیل میں حضرت مسیح کا ارشاد نقل کیا گیا ہے کہ ''جس کو خدا نے جوڑا اس کو کوئی نہ توڑے''، یہ ایک اخلاقی تعلیم تھی، مگر عیسائی دنیا نے اس کو ایک واجب العمل قانون کا درجہ دے دیا، بالآخر آہستہ آہستہ

مختلف اسباب ووجوہ کے باعث طلاق کی گنجائش پیدا کی گئی، اب طلاق کے جتنے زیادہ واقعات عیسائی اکثریت ملکوں میں پیش آتے ہیں، دنیا میں کہیں پیش نہیں آتے، اور تقریبا ہر عیسائی ملک میں نہ صرف طلاق کی اجازت ہے؛ بلکہ اس کو بہت آسان بنادیا گیا ہے؛ اس لئے یہ کہنا غلط نہیں ہوگا کہ جیسے نکاح فطرت کا تقاضا اور معاشرت ضرورت ہے، اسی طرح بوقت ضرورت طلاق کی گنجائش بھی فطرت کی آواز ہے اور یہ بھی معاشرہ کی ایک ضرورت ہے۔

طلاق کا حق شوہر کو کیوں؟

اب سوال یہ ہے کہ طلاق کا حق کس کو دیا جائے؟ امکانی طور پر اس کی چار صورتیں ہوسکتی ہیں:

الف–صرف عدالت کو طلاق دینے کا حق۔

ب–مرد کو اور عدالت کو طلاق دینے کا حق ہو

ج–صرف مرد کو طلاق کا حق حاصل ہو۔

د–صرف عورتوں کو طلاق دینے کا حق حاصل ہو۔

ھ–مرد و عورت دونوں کو طلاق دینے کا حق حاصل ہو۔

مشرق سے مغرب تک کسی بھی مہذب معاشرہ میں عورت کو طلاق دینے کا حق نہیں دیا گیا ہے، اور اس کی وجہ یہ ہے کہ عورتوں کے اندر قدرت نے جذبات کا وافر عنصر رکھا ہے، اور یہ اس کا عیب نہیں؛ بلکہ اس کا حسن ہے؛ کیونکہ اس کے بغیر وہ بے پناہ محبت کرنے والی ماں اور خوب پیار کرنے والی بیوی ثابت نہیں ہوسکتی، وفور جذبات سے جہاں محبت کی سوغات ملتی ہے، وہیں یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اس کی وجہ سے زود رنجی اور جلد

بازی پیدا ہوتی ہو، ہر وہ شخص جس کو خاندانی ومعاشرتی مسائل حل کرنے کا تجربہ ہو، وہ اس بات کی شہادت دے گا کہ خواتین بہت جلد کسی بات سے خوش بھی ہوجاتی ہیں اور ناراض بھی، فیصلہ کرنے میں عجلت سے بھی کام لیتی ہیں اور پھر بہت جلدی اپنے کئے پر پچھتاتی بھی ہیں؛اسی لئے خواتین کوکسی بھی مہذب سماج میں ایک طرفہ طور پرطلاق کا اختیارنہیں دیا گیا، نیز یہ بات بھی مناسب نہیں کہ طلاق کا اختیارتنہا مرد کو حاصل ہو، کیونکہ ایسی صورت میں عورت کا انصاف کا دروازہ بند ہوجائے گا اور ظالم شوہر سے نجات کی کوئی راہ باقی نہیں رہے گی۔

اس لئے اب صرف پہلی دوصورتیں رہ جاتی ہیں:

مغربی دنیا نے عام طور پر پہلا راستہ اختیار کیا ہے کہ طلاق کا اختیار عدالت کو حاصل ہوگا،شوہر سے بیوی کوشکایت ہو یا بیوی کوشوہر سے،انہیں عدالت کا دروازہ کھٹکھٹانا ہوگا اور عدالت کے فیصلہ کے ذریعہ ہی علاحدگی ہوگی، اسلامی شریعت نے عدالت کے اختیار کوختم نہیں کیا ہے؛لیکن طلاق کا انحصار اس پرنہیں رکھا ہے، اگرشوہر کی طرف سے زیادتی ہو، یا کسی وجہ سے عورت کواس کا شوہر پسندنہیں ہوتو اس کے لئے گنجائش ہے کہ وہ عدالت سے رجوع کرے اور عدالت اگرمحسوس کرے کہ اس کا دعوت درست ہےتوتفریق کا فیصلہ کردے۔

البتہ اسلام نے عدالت کے ساتھ مرد کوبھی طلاق کا اختیار دیا ہے،اس سلسلہ میں دوباتوں کوملحوظ رکھنا ضروری ہے؛

اول یہ کہ مردوں کو بے حد احتیاط کے ساتھ اس حق کے استعمال کرنے کی تلقین کی گئی ہے؛چنانچہ:

☆ جیسا کہ اوپر گزر چکا ہے، بلاضرورت طلاق دینا شریعت میں سخت ناپسندیدہ ہے اور فقہاء نے اس کو معصیت اور گناہ قرار دیا ہے، جو لوگ دینی مزاج رکھتے ہوں، گناہ کا خوف ان کو اس عمل سے باز رکھتا ہے۔

☆ اسلام میں ماں کا درجہ باپ سے بڑھ کر ہے، آپ ﷺ نے اس بات کو تمثیلی طور پر یوں سمجھایا ہے کہ باپ جنت کا دروازہ، یعنی ''مین گیٹ'' ہے (سنن الترمذی، باب ما جاء من الفضل فی رضا الوالدین: عن أبي الدرداء، حدیث نمبر: ۱۹۰۰) اور ماں کے قدموں کے نیچے جنت ہے (مسند الشہاب القضاعی: ۱/۱۰۲، عن انس بن مالک، حدیث نمبر ۱۱۹)، اس کی وجہ سے ایک تو ماں کی فطری محبت اولاد کے دل میں ہوتی ہی ہے، ساتھ ہی ساتھ مذہبی نقطہ نظر سے ماں کو جو یہ تقدس حاصل ہے، اس کی وجہ سے اولاد کے دل میں ماں کی خصوصی عظمت و محبت ہوتی ہے؛ اس لئے جب میاں بیوی صاحب اولاد ہوجاتے ہیں، اور اولاد ایک حد تک شعور کو پہنچ جاتی ہے تو باپ پر بال بچوں کا دباؤ ہوتا ہے اور وہ اپنے والد کو ایسا قدم اٹھانے سے روکتے ہیں۔

☆ تیسرے: اسلام نے کسب معاش کی ذمہ داری مرد پر رکھی ہے اور بال بچوں کا نفقہ اسی پر عائد ہوتا ہے، کسب معاش کے لئے اسے گھر سے باہر نکلنا پڑتا ہے اور وہ اس بات پر مجبور ہوتا ہے کہ بال بچوں کی تربیت، ان کی نگہ داشت اور دیکھ ریکھ کے لئے بیوی کا اعتماد حاصل کرے؛ اس لئے وہ نہیں چاہتا کہ طلاق واقع ہو اور اس کا خاندان بکھر جائے۔

☆ چوتھے: طلاق کی بناء پر عائد ہونے والی تمام مالی ذمہ داریاں مرد پر ہیں، اسے مہر ادا کرنا ہوتا ہے، جو اکثر خطیر رقم ہوتی ہے، اس کو نفقہ عدت ادا کرنا پڑتا ہے، اگر اس کے بچے چھوٹے ہوں تو لڑکے کے سات آٹھ سال عمر ہونے اور شعور کو پہنچنے تک اور لڑکیوں کے بالغ ہونے تک ماں کو حق پرورش حاصل ہے اور اس پوری مدت میں ان بچوں کا نفقہ

طلاق دینے والے شوہر کو ادا کرنا ہوتا ہے، اسی طرح جب تک بچے ماں کے زیر پرورش ہیں، ماں کو پرورش کی معقول رقم بھی ادا کرنی ہوتی ہے، جو اتنی مقدار ہو کہ اس سے اس کی ضروریات پوری ہوجائیں۔

پس یہ ساری مالی ذمہ داریاں مرد پر ہوتی ہیں، جو اسے طلاق کا قدم اٹھانے سے روکتی ہیں۔

پانچویں: عام طور پر میاں بیوی کے درمیان کوئی اختلاف پیدا ہوتا ہے اور یہ اختلاف بڑھتے بڑھتے طلاق تک پہنچ جاتا ہے، نزاع والدین اور اولاد کے درمیان بھی ہوتی ہے، بھائیوں اور بہن میں بھی ہوتی ہے، نزاع کے واقعات دوستوں کے درمیان بھی پیش آتے ہیں؛ لیکن ان نزاعات کو ختم کرنے کے سلسلہ میں قرآن مجید میں عمومی تعلیمات پر اکتفاء کیا گیا ہے؛ لیکن زوجین کے درمیان اختلاف کو مٹانے کے لئے مستقل طور پر زور دیا گیا اور اس کی تدبیر بتائی گئی کہ سب سے پہلے وعظ ونصیحت اور سمجھاؤ سے کام لیا جائے، اگر یہ کافی نہ ہو تو اپنی ناراضگی کے سنجیدہ اظہار کے لئے اپنی خواب گاہ اور بستر علاحدہ کرلو، یعنی وقتی طور پر بیوی سے مباشرت کرنا چھوڑ دو، پھر اگر یہ گریز بھی عورت کی اصلاح نہ کرسکے تو مناسب حدوں میں اس کی کمزوری اور نزاکت کو سامنے رکھتے ہوئے تھوڑی سی سرزنش بھی کرسکتے ہو، اب اگر اس کی اصلاح ہوجائے تو بہتر رفیق زندگی کی طرح اس کے ساتھ رہو، ان تمام صورتوں کو اختیار کرنے کے باوجود اصلاح نہ ہوسکے اور عورت بے جا نافرمانی اور زیادتی پر آمادہ ہو تو یہ اس بات کی علامت ہے کہ وہ آپس میں اس بگاڑ کو دور کرنے سے قاصر ہیں؛ لہٰذا ان حالات میں قرآن کا حکم ہے:

''اگر ان دونوں میں شدید اختلاف کا اندیشہ ہو تو مرد اور عورت دونوں کی طرف

سے ایک پنچ (حکم) کو بھیجو، اگر یہ دونوں واقعہ اصلاح چاہیں گے تو اللہ تعالی ضرور ان دونوں کے درمیان موافقت پیدا کر دیں، بے شک اللہ علیم وخبیر ہیں'' (سورۂ نساء: ۵۳)۔

اسی طرح مختلف ایسی صورتیں اختیار کی گئی ہیں کہ مرد حق طلاق کا بے جا استعمال نہ کرے؛ البتہ اس بنیاد پر کہ مرد کے اندر بمقابلہ عورتوں کے قوت فیصلہ زیادہ رکھی گئی ہے اور وہ عورتوں کے بہ نسبت کم جذباتی ہوتے ہیں، انہیں طلاق کا اختیار دیا گیا ہے۔

اکثر یہ سوال ذہن میں آتا ہے کہ ایسا کیوں نہ ہوا کہ طلاق کا اختیار عدالت ہی کو دے دیا جاتا؛ تاکہ کوئی شخص اس کا غلط استعمال نہیں کرتا؟ -لیکن غور کیا جائے تو یہ خیال درست نہیں، حقیقت یہ ہے کہ حق طلاق پوری طرح عدالت کو سونپ دینے میں کئی نقصانات ہیں:

اول یہ کہ اس کا نتیجہ ہوتا ہے کہ بعض دفعہ میاں بیوی دونوں چاہتے ہیں کہ ان کے درمیان علاحدگی ہو جائے، اور ان کا احساس ہوتا ہے کہ وہ دونوں ایک ساتھ نہیں رہ سکتے، مگر اس باہمی اتفاق کے باوجود انہیں علاحدگی حاصل کرنے میں اچھا خاصا وقت لگ جاتا ہے، اور وہ اپنی پسند کا نیا گھر آباد نہیں کر پاتے، بعض دفعہ تو اس میں سالہا سال گذر جاتے ہیں، اور کافی اخراجات بھی ہوتے ہیں، جو ایک کم آمدنی کی حامل عورت کے لئے ممکن نہیں ہوتا، اور اگر اس طرح کا معاملہ مسلمان میاں بیوی کا پیش آئے تو خاص کر اس کا زیادہ نقصان بیوی کو ہوگا؛ کیونکہ شوہر تو دوسرا نکاح کر لے گا؛ لیکن بیوی نیا گھر بسانے سے محروم رہے گی۔

دوسرا نقصان یہ ہے کہ عدالت کے ذریعہ طلاق حاصل کرنے میں دوسرے فریق کی کمزوریوں کو واضح کرنا پڑتا ہے، بعض اخلاقی کمزوریاں ایسی ہیں کہ معاشرہ میں مردوں

کی نسبت سے ان کو کم نا گوار سمجھا جاتا ہے، جیسے: اگر کسی مرد کے بارے میں کہا جائے کہ اس کا کردار اچھا نہیں ہے، وہ بدکردار اور بدزبان ہے، تو آئندہ رشتہ میں اس سے کچھ دشواری پیش آسکتی ہے؛ لیکن معمولی، اس کے برخلاف اگر مرد عدالت سے رجوع ہو اور وہ کہے کہ میری بیوی بدچلن ہے تو اس کے لئے نیا گھر آباد کرنا دشوار ہوجاتا ہے؛ اس لئے اس بات کا اندیشہ ہے کہ اس سے خواتین کو فائدہ پہنچنے کے بجائے نقصان پہنچے گا۔

تیسری بات یہ ہے کہ مرد کو حق طلاق دینے میں بالواسطہ طور پر عورتوں کی زندگی کا تحفظ ہے؛ کیونکہ یہ بات ظاہر ہے کہ نکاح ایک ایسا معاہدہ ہے، جس کے دونوں فریق جسمانی قوت کے اعتبار سے برابر نہیں ہیں، مرد طاقتور ہے اور عورت کمزور ہے، مرد عام طور پر اپنی حفاظت کے لئے عورت کا محتاج نہیں ہوتا، عورت اپنے تحفظ کے لئے مرد کی محتاج ہوتی ہے، ایسی صورت میں اگر میاں بیوی کے درمیان شدید نفرت پیدا ہوجائے اور شوہر کسی طرح اس عورت کے ساتھ رہنا چاہتا ہو؛ لیکن قانون اسے مجبور کرتا ہو، اور عدالت کی طویل العمل اور خرچ طلب کاروائی کے بغیر وہ قانونی طور پر علاحدگی حاصل کرنے سے قاصر ہو تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ غیر قانونی راستہ اختیار کرے گا، اور بیوی کے قتل کا اور اسے زندہ جلانے کا مرتکب ہوگا، اور یہ بات بھی ظاہر ہے کہ خدا نا ترس مرد کے لئے بیوی کے ساتھ ایسے جرم کا ارتکاب دشوار نہیں؛ کیونکہ وہ رات کی تاریکی اور کمرے کی تنہائی میں بھی اس کے ساتھ ہوتا ہے، وہ زورج کی روشنی ہی سے نہیں؛ بلکہ گواہان کی آنکھوں سے بھی اپنے جرم کو چھپا سکتا ہے، اور بہت سی دفعہ ایسے مجرمین شبہ کا فائدہ اٹھا کر عدالت کی گرفت سے بھی آزاد ہوجاتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ ہندوستان میں ہندو معاشرہ تعلیم یافتہ ہونے کے باوجود عورت کو قتل کرنے اور ان کو نذر آتش کرنے کے جرم میں زیادہ ملوث پایا جاتا

ہے،کم تعلیم یافتہ اور معاشی اعتبار سے پسماندہ ہونے کے باوجوداس جرم میں مسلمانوں کا تناسب کم ہے، گویا طلاق کی حیثیت بجلی کے فیوز کی ہے، جوخوداڑ جاتا ہے؛لیکن پورے گھر کی برقی کو بچالیتا ہے، ٹھیک اسی طرح طلاق ایک ناخوشگوار واقعہ ہے؛ لیکن وہ اس سے زیادہ ناخوشگوار واقعات کوروکنے کا مؤثر ذریعہ ہے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ بیوی کے ساتھ زیادتی کے واقعات بڑھتے جارہے ہیں اور ہندوستان میں جہیز کی اموات میں اضافہ ہوتا جارہا ہے، اس کا اندازہ درج ذیل اعداد وشمار سے لگایا جاسکتا ہے:

2006=7618

2007=8093

2008=8172

2009=8383

2010=8242

Total 5 Years=40508

یقیناً اس میں دوسرے عوامل کا بھی دخل ہے؛ لیکن ایک اہم سبب طلاق کومشکل بنادینا بھی ہے۔

یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ حالانکہ مغربی معاشرہ میں بھی تنہا عورت کو طلاق کا حق نہیں دیا گیا ہے؛ لیکن مرد وعورت کو مساوی حق دینے اور بذریعہ عدالت طلاق کا اختیار حاصل ہونے کا نتیجہ یہ ہے کہ ان ملکوں میں طلاق کا تناسب بے حد بڑھ گیا ہے، اس کا اندازہ درج ذیل اعداد وشمار سے کیا جاسکتا ہے، جس میں فی سونکاح طلاق کی شرح واضح کی گئی ہے:

۱-جاپان60.0

۲-جرمنی39.4

۳-برطانیہ42.6

۴-روس43.3

۵-چیک جمہوریہ43.3

۶-بلجیم44.0

۷-ڈنمارک44.5

۸-امریکہ54.8

۹-سویڈن54.9

۱۰-بیلاروس52.9

۱۱-آسٹریا43.4

۱۲-ناروے40.4

۱۳-فرانس38.3

۱۴-نیدرلینڈ38.3

۱۵-ہنگری37.5

۱۶-سلوواکیا26.9

۱۷-پرتگال26.2

۱۸-سوئزرلینڈ25.5

(مزید تفصیل کے لئے دیکھئے:www.divorcemag.com)

کے ڈی شرما نے اپنے ایک مضمون میں لکھا ہے:

''امریکہ میں طلاق وتفریق نے شادی کی وہ مٹی پلید کردی ہے اور اس کے ایسے نتائج پیدا ہوئے ہیں، جس کی کوئی مثال جدید تاریخ میں نہیں ملتی، ہر چوتھی شادی طلاق پر ختم ہوتی ہے؛ حالانکہ یہاں کی آبادی دنیا کی کل آبادی کا صرف چھ فیصد ہے'' (مغربی تہذیب انحطاط کی شاہراہ پر از اکرام اللہ ص ۲۷۸)۔

عورت کے لئے حق طلاق کا متبادل

اس کے ساتھ دو اور باتوں کی وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے، اول یہ کہ ایسا نہیں ہے کہ مرد کو تو حق طلاق دے دیا گیا ہو اور عورت کے لئے کوئی راستہ نہیں رکھا گیا ہو؛ بلکہ عورتوں کے لئے شوہر سے علاحدگی کے تین راستے ہیں:

تفویض طلاق، خلع اور عدالت کے ذریعہ فسخ نکاح۔

تفویض طلاق کا مطلب یہ ہے کہ نکاح سے پہلے یا نکاح کے وقت یا نکاح کے بعد بیوی اپنے شوہر سے اس بات کا حق حاصل کرلے کہ وہ جب بھی چاہے گی، اپنے اوپر طلاق واقع کرلے گی، ایسی صورت میں اس کو اپنے آپ پر طلاق واقع کرنے کا حق حاصل ہوتا ہے، خاص کر اگر شوہر کی طرف سے ظلم و زیادتی ہو اور بعد میں صلح کی صورت پیدا ہوجائے تو اس وقت تفویض طلاق عورت کے لئے مستقبل میں شوہر کے ظلم سے بچنے کا ایک مؤثر ذریعہ بنتا ہے۔

خلع یہ ہے کہ عورت اپنے شوہر کو طلاق دینے پر رضامند کرلے، خواہ مہر معاف کر کے یا کچھ دے کر، عام حالات میں خلع شوہر کی رضامندی ہی سے ہوسکتا ہے؛ لیکن اگر میاں بیوی کے درمیان شدید اختلاف ہو، بظاہر کوئی خاص سبب نہ ہو؛ لیکن نفرت اس قدر

بڑھ گئی ہو کہ وہ ایک دوسرے کے ساتھ پرسکون زندگی گذارنے سے قاصر ہوں تو اس صورت میں امام مالکؒ کے نزدیک قاضی کو یہ اختیار ہے کہ وہ شوہر کی رضامندی کے بغیر بھی خلع کردے، اور ہندوستان میں عام طور پر دارالقضاء کا عمل اسی پر ہے۔

اگر شوہر ظلم وزیادتی کرتا ہو، بیوی کو جسمانی اور ذہنی تکلیف پہنچاتا ہو، اس کے مالی، صنفی یا اخلاقی حقوق ادا نہیں کرتا ہو تو ان تمام صورتوں میں عورت کو عدالت کے ذریعہ نکاح فسخ کرانے کا حق حاصل ہے، جس کی تفصیل کتب فقہ میں موجود ہے، اس لئے یہ نہیں سمجھنا چاہئے کہ اسلام نے مردوں کو تو طلاق کا اختیار دے دیا ہے؛ لیکن عورت کے لئے کوئی راستہ نہیں رکھا ہے۔

اگرچہ ہندو میرج ایکٹ میں بھی عورت کے لئے عدالت کے ذریعہ طلاق حاصل کرنے کی گنجائش رکھی گئی ہے، لیکن اس کی اجازت بہت محدود ہے، شریعت اسلامی میں اس سلسلہ میں زیادہ وسعت ہے، چنانچہ سولہ اسباب ہیں، جن کی بنیاد پر عورت قاضی کے ذریعہ علاحدگی حاصل کرسکتی ہے (دیکھئے مجموعہ قوانین اسلامی، قانون فسخ نکاح، دفعہ: ۳۲۲)۔

ہندوستانی مسلمان اور طلاق کے واقعات

دوسری بات یہ ہے کہ عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ مسلمانوں میں طلاق کے واقعات بہت زیادہ ہوتے ہیں؛ لیکن یہ محض غلط فہمی یا پروپگنڈہ ہے، آزادی کے بعد سے جو سروے کئے گئے ہیں، ان کے مطابق مسلمانوں میں طلاق کا تناسب بمقابلہ دوسری قوموں کے کم ہے، شاید اس کی ایک وجہ تعدد ازدواج کی اجازت بھی ہے؛ چونکہ دوسری اقوام میں تعدد ازدواج کی اجازت نہیں ہے؛ اس لئے اگر کوئی مرد کسی وجہ سے کسی اور عورت سے نکاح کرنا چاہتا ہے، خواہ اپنی خواہش کی وجہ سے، یا کسی مجبوری کی وجہ سے، یا

بیوی کا رویہ نامناسب ہونے کی وجہ سے،تو بہرحال اسے پہلی بیوی سے چھٹکارا حاصل کرنا پڑتا ہے؛لیکن اسلام نے چونکہ پہلی بیوی کے ہوتے ہوئے دوسرے نکاح کی اجازت ہے؛ اس لئے طلاق دینے کی ضرورت پیش نہیں آتی ہے، اس سلسلے میں ایک سروے رپورٹ ڈاکٹر شائستہ پروین کی کتاب ''ہندوستانی معاشرہ میں تعدد ازدواج'' سے نقل کرنا مناسب ہوگا:

''زویا حسن Zoya Hasan (جواہر لال نہرو یونیورسٹی میں ماہر لسانیات اور ریتومینن Ritu Menon (پبلشر اور رائٹر) کی زیر نگرانی کل ہند پیمانہ پر یہ سروے کرایا گیا، اس سروے میں مسلم خواتین کا مختلف میدان ہائے کار میں احاطہ کیا گیا، مثلاً: خوانگی، سماجی واقتصادی صورت حال، شادی، تعلیم، فیصلہ سازی، سیاسی بیداری وغیرہ۔

اس سروے نے عام تاثر کی نفی کی کہ مسلم خواتین پردہ، تعدد ازدواج اور ایک مجلس میں تین طلاق کی قیدی بن چکی ہیں، اس جائزے میں ۱۲/ریاستوں کے ۴۰/اضلاع کا احاطہ کیا گیا، ۹۶۴۱/خواتین کی آراء لی گئیں، جس میں ۸۰/فیصد مسلم اور ۲۰/فیصد ہندو تھیں اور ان خواتین میں ۶۰/فیصد دیہی اور ۴۰/فیصد شہری علاقوں سے تعلق رکھتی تھیں، اس جائزے میں بہت سے حقائق ابھر کر سامنے آئے، مثلاً:

طلاق کا تناسب مسلمانوں میں 0.41

طلاق کا تناسب ہندوؤں میں 0.47

تعدد ازدواج کی شرح مسلمانوں میں 2.9

تعدد ازدواج کی شرح ہندوؤں میں 4.05

(کتاب مذکور:ص/۱۹۰)

خلاصہ کلام

حاصل یہ ہے کہ اسلام کی نظر میں طلاق ایک ناپسندیدہ عمل ہے؛ لیکن ایک ناخوشگوار سماجی ضرورت کی حیثیت سے اس کی اجازت دی گئی ہے، اس کا اختیار مرد کو دیا گیا ہے؛ تاکہ وہ نفرت پیدا ہوجانے کی صورت میں رشتہ کو ختم کرنے کے لئے غیر قانونی راستہ اختیار نہ کرے، عورتوں کے لئے اس کے متبادل کے طور پر تفویض طلاق کا حق حاصل کرنے کی، خلع کی اور قاضی کے ذریعہ فسخ وتفریق کی گنجائش رکھی گئی ہے، عدالت کو حق طلاق اس لئے نہیں سونپا گیا کہ اس کی وجہ سے اسباب طلاق کو واضح کرنا ہوگا اور یہ بات عورت کے لئے نئی زندگی شروع کرنے میں رکاوٹ بن سکتی ہے۔

☆☆☆

طلاق سے پہلے تحکیم

آسام ہائی کورٹ کے سابق جسٹس بحر الاسلام نے اپنے ایک فیصلے میں اسلام کے قانون طلاق کی اس طرح تشریح کی ہے کہ طلاق واقع ہونے کے لئے یہ بات ضروری ہے کہ طلاق سے پہلے زوجین کے درمیان ثالث کے ذریعہ صلح کی کوشش کی جائے، اگر اس طرح کی کوشش نہیں کی گئی اور اس کے بغیر شوہر نے طلاق دے دی تو وہ طلاق معتبر نہیں ہوگی، اس فیصلہ کے بعد مختلف عدالتوں سے مسلسل اس طرح کے فیصلے آرہے ہیں- اور عام طور پر لوگوں کو بھی یہ بات بہتر محسوس ہوتی ہے کہ بجائے اس کے کہ شوہر صلح کی کسی کوشش کے بغیر طلاق دے دے، پہلے زوجین کے درمیان مصالحت کی کوشش کی جائے، اگر یہ کوشش سودمند ثابت نہ ہو تب طلاق کا قدم اٹھایا جائے؛ اس لئے اس مسئلہ پر تین پہلوؤں سے غور کرنے کی ضرورت ہے:

اول: عقل ومصلحت کے اعتبار سے یہ بات کہاں تک درست ہے؟

دوسرے: کیا شریعت اسلامی نے واقعتا طلاق سے پہلے تحکیم کو لازم قرار دیا ہے؟

تیسرے: عدالت نے اس سلسلہ میں قرآن کی جس آیت سے استدلال کیا ہے، کیا وہ استدلال برمحل ہے؟

عقل ومصلحت کا تقاضا

جہاں تک عقل ومصلحت کے پہلو سے اس پر غور کرنے کی بات ہے تو یہ بات

واقعۃً بہتر معلوم ہوتی ہے کہ طلاق کا آخری چارہ کار کے طور پر کیا جائے، اس سے پہلے باہمی صلح وصفائی کی تدبیریں کی جائیں، انہیں تدبیروں میں سے ایک یہ ہے کہ اگر زوجین آپس میں مسئلہ کو حل نہ کرسکیں تو خاندان کے بزرگوں، یا سماج کے کسی اور ذمہ دار شخص کے ذریعہ نزاع کو سلجھانے کی کوشش کریں، قرآن نے اگرچہ ثالثی سے طلاق کو مربوط نہیں کیا ہے؛ لیکن زوجین کے درمیان اختلاف کو حل کرنے کی مختلف تدبیریں بتائی ہیں، ان میں ایک تدبیر یہ بھی ہے، جس کا سورہ نساء کی آیت نمبر: ۳۴، ۳۵ میں ذکر آیا ہے؛ البتہ اس کو لازم قرار نہیں دیا گیا ہے، اور نہ طلاق کے معتبر ہونے کے لئے اس کو شرط کا درجہ دیا گیا ہے۔

غور کیا جائے تو اس کو لازم نہ کرنے میں عورتوں ہی کا مفاد ہے؛ کیونکہ طلاق زندگی کا بند دروازہ نہیں، جس کے آگے کوئی راستہ نہ ہو؛ بلکہ یہ ایک مرحلہ کا اختتام اور دوسرے مرحلہ کا آغاز ہے، طلاق کے ذریعہ زندگی کا ایک باب بند ہوتا ہے اور دوسرا باب کھلتا ہے، عورت کا پہلا رشتۂ نکاح ختم ہوتا ہے اور دوسرے نکاح کی راہ ہموار ہوتی ہے، اگر شوہر پر یہ بات لازم قرار دی جائے کہ وہ ان اسباب ووجوہ کی وضاحت کرے، جن کی وجہ سے اس نے طلاق دی ہے تو ہوسکتا ہے کہ بہت سی دفعہ ان کا ظاہر کرنا خود عورت کے مفاد میں نہ ہو، ایسے مواقع پر ایک شریف اور باعزت میاں بیوی اس بات کو بہتر سمجھتے ہیں کہ علاحدگی ہوجائے اور ایسے واقعات پردہ ہی میں رہیں؛ تاکہ کسی فریق کی بے عزتی اور بے آبروئی نہ ہو اور اگر طلاق کا سبب عورت کی طرف سے پائی جانے والی کوتاہیاں نہ ہوں، تب بھی اس بات کا قوی اندیشہ ہے کہ خدا ناترس شوہر جھوٹ بولے، اور اپنی بیوی کے کردار پر حملہ کرے؛ تاکہ طلاق دینے کے عمل کو درست ثابت کرسکے، ہر دو صورت میں

عورت کے لئے آئندہ زندگی کا آغاز مشکل ہوجائے گا، جب سماج تک یہ بات پہنچے گی کہ فلاں شخص کی بیوی پر بدکردار، بداخلاق، بدزبان اور نافرمان ہونے کا الزام ہے تو غور کیجئے کہ کوئی شخص اس کو اپنی بیوی یا بہو بنانے پر تیار ہوگا؟ ہندوستان کے موجودہ معاشرہ کی صورت حال یہ ہے کہ کنواری لڑکیوں کا رشتہ ملنا دشوار ہوتا ہے، وہاں کیا ایسی مطلقہ عورتوں کا رشتہ ملنا آسان ہوگا، جن کی کمزوریاں طشت از بام ہوچکی ہوں یا وہ ہوں تو بے قصور؛ لیکن انہیں بدنام کردیا گیا ہو؟ - اس لئے حقیقت یہ ہے کہ طلاق سے پہلے تحکیم کو ضروری قرار دینا عورتوں کے لئے نقصان دہ ہے نہ کہ فائدہ مند۔

شریعت اسلامی کی روشنی میں!

اب ہم دیکھتے ہیں کہ کیا شریعت اسلامی میں طلاق سے پہلے تحکیم کو لازم قرار دیا گیا ہے؟ - اس سلسلہ میں ہم قرآن مجید، حدیث نبوی ﷺ، آثار صحابہ، اجماع امت اور قیاس کی روشنی میں مسئلہ کا جائزہ لیں گے:

قرآن مجید

قرآن مجید میں مجموعی طور پر چودہ مقامات پر طلاق سے متعلق احکام ذکر کئے گئے ہیں، ان میں کہیں بھی طلاق سے پہلے حَکَم یا ثالث بنانے کا ذکر نہیں ہے، بعض آیتوں میں عدت کے احکام ہیں، بعض آیات میں طلاق کے بعد پیدا ہونے والی علاحدگی کی نوعیت کو واضح کیا گیا ہے، بعض آیات مطلقہ کے حقوق کو واضح کرتی ہیں، بعض میں طلاق دینے کا طریقہ بتایا گیا ہے؛ لیکن کہیں بھی یہی بات نہیں کہی گئی ہے کہ طلاق اس وقت تک نہیں دے سکتے، جب تک کسی کو ثالث بنا کر باہم معاملہ کو حل کرنے کی کوشش نہ کرلی جائے۔

طلاق دینے کا طریقہ اور اس کا حکم کیا ہے؟......اس کو سورہ بقرہ کی آیت نمبر ۲۲۹

اور ۲۳۰ نے واضح کیا ہے؛ چنانچہ قرآن کہتا ہے:''**الطلاق مرتان فإمساک بمعروف أو تسریح بإحسان ولا یحل لکم أن تأخذوا مما اتیتموھن شیئا إلا أن یخافا ألا یقیما حدود الله فإن خفتم الا یقیما حدود الله فلا جناح علیھما فیما افتدت به تلک حدود الله فلا تعتدوھا ومن یتعد حدود الله فاولائک ھم الظالمون–فإن طلقھا فلا تحل له من بعد حتی تنکح زوجا غیرہ فإن طلقھا فلا جناح علیھما أن یتراجعآ إن ظنا أن یقیما حدود الله وتلک حدود الله یبینھا لقوم یعلمون**''('' طلاقیں (جس کے بعد بیوی کولوٹانے کی گنجائش ہے) دومرتبہ ہیں، پھر یاتو بھلے طریقے پرروک لینا ہے، یا عمدگی کے ساتھ چھوڑ دینا، اورتمہارے لئے یہ حلال نہیں کہ تم نے انہیں جو دیا ہے(یعنی مہر وغیرہ)، ان میں سے کچھ لے لو، سوائے اس کے کہ دونوں کو اندیشہ ہو کہ وہ اللہ کی حدود کو قائم نہیں کرسکیں گے، اگر تم کو اندیشہ ہو کہ وہ دونوں اللہ کے حدود کو قائم نہیں رکھ پائیں گے، توعورت رہائی پانے کے لئے کچھ دے دے، اس میں دونوں پر گناہ نہیں، یہ اللہ کی حدود ہیں، ان سے تجاوز نہ کرو، اور جو اللہ کی حدود سے تجاوز کرے، وہی ظالم ہے، پھر اگر بیوی کو (تیسری بار) طلاق دے دے تو اب وہ عورت اس کے لئے حلال نہیں، جب تک کہ وہ کسی اور مرد سے نکاح نہ کرے، پھر اگر وہ بھی طلاق دے دے، تو ان دونوں کے لئے مضائقہ نہیں کہ وہ دوبارہ نکاح کرلیں، اگر انہیں گمان ہو کہ وہ اللہ کی حدود کو قائم رکھ سکیں گے، اور یہ اللہ تعالی کی حدود ہیں، جنہیں وہ ان لوگوں کے لئے بیان فرمارہے ہیں، جو جاننا چاہیں)۔

اس آیت میں اللہ تعالی نے تین باتیں فرمائی ہیں؛

پہلی بات یہ ہے کہ اگر ایک یا دو طلاق دی جائے تو نیا نکاح کئے بغیر بیوی کو

لوٹایا جاسکتا ہے، دوسری آیات واحادیث سے وضاحت ہوتی ہے کہ یہ گنجائش عدت کے گذرنے تک ہے۔

دوسری بات یہ بتائی گئی ہے کہ اگر شوہر نے بیوی کو مہر ادا کردیا ہو، یا کچھ اور حسن سلوک کیا ہو، تو مناسب نہیں کہ طلاق دیتے ہوئے ان چیزوں کو واپس لے لیا جائے، ہاں! اگر عورت خود طلاق کی خواہش مند ہو، اور وہ اپنی طرف سے خود مہر واپس کرنا چاہے تو اس کی گنجائش ہے۔

تیسری بات یہ ہے کہ اگر شوہر نے تیسری طلاق بھی دے دی تو اب وہ عورت اس کے لئے حرام ہوجاتی ہے، اب اسے لوٹانے یا دوبارہ نکاح کر لینے کی گنجائش نہیں؛ بلکہ اب ان دونوں کے درمیان دوبارہ ازدواجی زندگی کی صورت اسی وقت ممکن ہے، جب کہ اس عورت کا کسی اور مرد سے نکاح ہوا ہو، اور اتفاق سے دوسرا شوہر بھی اسے طلاق دے دے، اب دوبارہ پہلے شوہر سے اس کا نکاح ہوسکتا ہے۔

طلاق دینے کا طریقہ اور اس کے احکام کے بارے میں یہ بنیادی آیت ہے، اس سلسلہ میں دوسری آیت سورۂ طلاق کی آیت نمبر ٦۵ ہے، جس میں فرمایا گیا ہے کہ طلاق دینے کے لئے ایسے وقت کا انتخاب کیا جائے کہ عدت طویل نہ ہوجائے؛ اس لئے حالت حیض میں طلاق نہیں دی جائے ''**فطلقوهن لعدتهن**''...... ان آیات میں کہیں بھی یہ بات نہیں کہی گئی ہے کہ طلاق واقع ہونے کے لئے یہ بات ضروری ہے کہ طلاق سے پہلے مصالحانہ کوششیں کی گئی ہوں؛ تب ہی طلاق معتبر ہوگی۔

حدیثیں

قرآن مجید کے بعد شریعت کا سب سے اہم مأخذ حدیث ہے، حدیثوں میں بھی

کہیں ایسی شہادت نہیں ملتی کہ آپ ﷺ نے مصالحتی کوشش کو طلاق کے لئے شرط قرار دیا ہو، یا طلاق کے مسائل سامنے آنے کے بعد آپ ﷺ نے تحقیق کی ہو کہ تم نے طلاق دینے سے پہلے کسی کو ثالث بنانے کے بعد مسئلہ حل کرنے کی کوشش کی تھی یا نہیں؟......اس سلسلہ میں عہد نبوی کی چار مثالیں پیش کی جاتی ہیں:

۱-خود رسول اللہ ﷺ نے ام المؤمنین سیدنا حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کو طلاق دے دی تھی، اور پھر انہیں واپس لوٹا لیا تھا (سنن ابی داؤد عن عمر، حدیث نمبر: ۲۲۸۳) حضرت عقبہ بن عامرؓ کی روایت میں وضاحت ہے کہ حضرت جبرئیل علیہ السلام آپ ﷺ کی خدمت میں آئے اور عرض کیا: اللہ تعالی نے حکم دیا ہے کہ آپ حفصہ کو لوٹا لیں؛ چنانچہ آپ ﷺ نے رجعت فرمالی (جمع الفوائد، حدیث نمبر: ۴۴۲۱، بحوالہ طبرانی)......اس حدیث میں حَکم بنانے کا کوئی ذکر نہیں ہے، اور سوال یہ ہے کہ جب معاملہ مسلمانوں کا ہو تو آپ ﷺ کے سوا حَکم کوئی اور ہو بھی کیسے سکتا ہے؛ کیونکہ رسول اللہ ﷺ کی ذات تو خود پوری امت کے لئے حَکم ہے "**فلا وربک لا یؤمنون حتی یحکموک فیما شجر بینھم**" (نساء: ۶۵)۔

۲-"**أخبرنی سالم: أن عبد الله بن عمر رضی الله عنهما أخبره: أنه طلق إمرأته وهی حائض، فذکر عمر لرسول الله ﷺ فتغیظ فیه رسول الله ﷺ ثم قال: لیراجعها ثم یمسکها حتی تطهر، ثم تحیض فتطهر، فإن بدأله أن یطلقها فلیطلقها طاهرا قبل أن یمسها**" (صحیح البخاری: کتاب التفسیر، سورہ طلاق، حدیث نمبر ۴۹۰۸) (سالم روایت کرتے ہیں کہ حضرت عبد اللہ بن عمرؓ نے ان سے نقل کیا ہے کہ انہوں نے اپنی بیوی کو حالت حیض میں طلاق دے دی تھی، حضرت عمرؓ نے حضور ﷺ سے اس کا ذکر کیا، آپ ﷺ بہت ناراض ہوئے اور فرمایا: انہیں کہا جائے کہ

بیوی کو لوٹالیں، یہاں تک کہ وہ پاک ہوجائے، پھر حیض آئے اور اس کے بعد پاک ہوجائے،اب اگر طلاق دینے ہی کا ارادہ ہوتو پاکی کی حالت میں صحبت کرنے سے پہلے ہی طلاق دے دیں)۔

لوٹانے کا حکم آپ ﷺ نے اس لئے دیا کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے ایک ہی طلاق دی تھی اور لوٹانے کی گنجائش باقی تھی،اس واقعہ میں رسول اللہ ﷺ نے حضرت عمرؓ سے دریافت نہیں فرمایا کہ مصالحتی کوشش کی گئی تھی یا نہیں؟ روایات سے محسوس ہوتا ہے کہ آپ ﷺ کو اچانک اس واقعہ کی اطلاع ملی؛اسی لئے آپ ﷺ کی سخت ناراضگی کا باعث بنا،اگر مصالحتی کوشش کے بغیر دی گئی طلاق واقع نہ ہوتی تو آپ ﷺ فرماتے کہ طلاق پڑی ہی نہیں،آپ ﷺ لوٹانے کا حکم نہیں دیتے۔

۳-حضرت عبادہ بن صامتؓ سے روایت ہے کہ میرے دادا نے اپنی بیوی کو ایک ہزار طلاقیں دے دیں،رسول اللہ ﷺ سے اس بارے میں دریافت کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا: کیا تمہارے دادا کو اللہ کا خوف نہیں؟ پھر ارشاد فرمایا: تین طلاقیں تو پڑ گئیں،باقی نو سو ستانوے ''عدوان اور ظلم'' ہیں، اللہ چاہیں تو عذاب دیں یا معاف کردیں(مجمع الزوائد ۴/ ۳۳۸،باب فیمن طلق أکثر من ثلاث)......

اس واقعہ میں بھی مصالحتی کوشش کا کوئی ذکر نہیں اور نہ آپ ﷺ نے اس بارے میں دریافت کیا،اگر طلاق واقع ہونے کے لئے مصالحانہ کوشش ضرور ہوتی تو آپ ﷺ نے ضرور اس بارے میں دریافت فرمایا ہوتا۔

(د)"عن محمود بن لبید قال: أخبر رسول الله ﷺ عن رجل طلق إمرأته ثلاث تطلیقات جمیعا، فغضب، ثم قال أیلعب بکتاب الله وأنا بین أظهرکم؟ حتی قام رجل فقال: یا رسول الله ألا أقتله" (سنن نسائی: کتاب

الطلاق، باب ثلاث المجموعہ ومافیہ من التغلیظ)۔

(ایک شخص کے بارے میں رسول اللہ ﷺ کو اطلاع دی گئی کہ اس نے اپنی بیوی کو ایک ساتھ تین طلاق دے دی، تو آپ ﷺ نے غضبناک ہوگئے، پھر فرمایا: کیا اللہ کی کتاب کے ساتھ کھلواڑ کیا جاتا ہے، حالانکہ میں تمہارے درمیان موجود ہوں، یہاں تک کہ ایک صاحب کھڑے ہوئے اور کہنے لگے: اللہ کے رسول؛ میں اسے قتل ہی نہ کر ڈالوں؟)۔

ایک ہزار طلاق دینے سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ یہ طلاق اچانک اور سخت غصہ کی حالت میں دی گئی، بہ ظاہر ایسے حالات اس وقت پیدا ہوتے ہیں......مصالحتی کوششیں نہیں ہوتی ہیں۔

آثار صحابہ

صحابہؓ کے فتاوی اور ان کی آراء قران وحیث کی شرح کا درجہ رکھتی ہیں؛ اسی لئے صحابہؓ کے فتاوی کو شریعت میں بڑی اہمیت حاصل ہے اور فقہاء نے انہیں بھی مسائل میں حدیث کا درجہ دیتے ہیں، جن میں اجتہاد کا دخل نہ ہو، صحابہؓ کے فتاوی سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ طلاق واقع ہونے کے لئے پہلے ثالث کے ذریعہ مصالحانہ کوشش سے گذرنا ضروری نہیں، چند اقوال نقل کئے جاتے ہیں:

ا-"عن زید بن وهب، أن رجلا بطالا کان بالمدینة، طلق إمرأته ألفا، فرجع إلی عمر فقال: إنما کنت العب، فعلا عمر رأسه بالدرة وفرق بینهما" (مصنف ابن ابی شیبہ: کتاب الطلاق، باب فی الرجل یطلق إمرأته مائة أو ألفا، حدیث نمبر:۱۸۰۸۷)۔

(مدینہ میں ایک پہلوان قسم کا آدمی تھا، جس نے اپنی بیوی کو ایک ہزار طلاق

دی، پھر حضرت عمرؓ سے رجوع ہوا، حضرت عمرؓ نے فرمایا تو تو بڑا کھلاڑی ہے، پھر حضرت عمرؓ نے اس کے سر پر درہ لگائے اور دونوں کے درمیان تفریق کردی)۔

۲-"جاء رجل إلى عثمان فقال: إني طلقت إمرأتي مئة، قال: ثلاث يحرمنها عليک، وسبعة وتسعون عدوان:" (مصنف ابن ابی شیبہ: کتاب الطلاق، باب فی الرجل یطلق إمرأته مئة أو ألفا فی قول واحد، حدیث نمبر: ۱۸۱۰۴)۔

(ایک صاحب حضرت عثمان کے پاس آئے اور کہا: میں نے اپنی بیوی کو سو طلاق دے دی، حضرت عثمان نے فرمایا: تین طلاقیں تو تمہاری بیوی کو تم پر حرام کردیں گی اور ستانوے (تمہاری طرف سے) ظلم وعدوان ہیں)۔

۳-"عن حبيب قال: جاء رجل إلى علي فقال: إني طلقت إمرأتي ألفا، قال: بانت منک بثلاث وأقسم سائرها بين نسائک" (مصنف ابن أبی شیبہ: کتاب الطلاق، باب فی الرجل یطلق أمرأته أو الفا فی قول واحد، حدیث نمبر: ۱۷۹۰۲)۔

(ایک صاحب حضرت علیؓ کے پاس آئے اور کہا میں نے اپنی بیوی کو ایک ہزار طلاق دے دی ہے، حضرت علی نے فرمایا: تین طلاق کی بنا پر وہ تم سے جدا ہوگئی، اور (غصہ کا اظہار کرتے ہوئے) فرمایا کہ بقیہ کو اپنی اور بیویوں کے درمیان تقسیم کردو)۔

۴-"كانت عائشة الخثعمية عند الحسن بن علي رضي الله عنه، فلما قتل علي رضي الله عنه قالت: لتهنئک الخلافة، قال: بقتل علي تظهر من الشماتة، اذهبي فأنت طالق، يعني ثلاثا قال فتلففت بثيابها وقعدت حتى قضت عدتها، فبعث إليها ببقية بقيت لها من صداقها وعشرة آلاف صدقة، فلما جاء ها الرسول قالت: متاع قليل من حبيب مفارق، فلما بلغة قولها بكى، ثم قال: لولا أني سمعت جدي أو حدثني

أبی أنه سمع جدی یقول: أیما رجل طلق إمرأته ثلاثا عند الأقراء أو ثلاثا مبهمة لم تحل له حتی تنكح زوجا غیره لراجعتها" (السنن الکبری للبیہقی: کتاب الخلع والطلاق، باب ماجاء فی امضاء الطلاق الثلاث وإن کن مجموعات، حدیث نمبر:۱۴۹۷۱)۔

(عائشہ خشعمیہ حضرت بن علی رضی اللہ عنہ کے نکاح میں تھیں، جب حضرت علیؓ شہید کردیئے گئے توانہوں نے عرض کیا: آپ کوخلافت مبارک ہو، حضرت حسن نے کہا: کیا تم حضرت علی کے قتل پر شماتت ظاہر کرتی ہو، چلی جاؤ، تم کوتین بارطلاق ہے، انہوں نے (اپنے آپ پر پردہ کے لئے) کپڑے لپیٹ لئے اور بیٹھ گئیں، یہاں تک کہ عدت گذر گئی، پھر حضرت حسنؓ نے ان کومہر کا بقیہ حصہ نیز دس ہزار درہم زائد بھیجے، جب ان کے پاس قاصد پہنچا توانہوں نے کہا: جس محبوب سے جدائی ہوئی ہے، اس کے مقابلہ میں یہ تحفہ تھوڑا ہے، جب حضرت حسن کوان کی یہ بات پہنچی تو رونے لگے، پھر فرمایا: اگر میں نے اپنے نانا سے نہ سنا ہوتا، یا کہا: میرے والد نے مجھ سے میرے نانا کی یہ بات نقل نہ کی ہوتی کہ جس آدمی نے اپنی بیوی کوالگ الگ طہر میں تین طلاقیں دی ہوں یا ایک ساتھ تین طلاقیں دی ہوں تو وہ عورت اس کے لئے حلال نہیں، یہاں تک کہ وہ کسی دوسرے مرد کے نکاح میں آئے، تو میں نے اس سے رجوع کرلیا ہوتا)۔

۵-"**عن علقمة عن عبد الله أنه سئل عن رجل طلق امرأته مائة تطليقة، قال: حرمتها ثلاث وسبعة وسبعون عدوان**" (مصنف عبد الرزاق: کتاب الطلاق، باب فی الرجل یطلق امرأته مائة أو ألفا، حدیث نمبر:۱۷۷۹۹)۔

(حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے ایسے شخص کے بارے میں سوال کیا گیا، جس نے اپنی بیوی کو ۱۰۰ طلاق دے دی تھی، آپؓ نے فرمایا: تین طلاق نے اس کی بیوی کوحرام کردیا)۔

۶-"جاء رجل إلى ابن عباس فقال إنى طلقت أمرأتى ألفا ومائة، قال: بانت منک بثلاث وسائرهن وزر إتخذت آيات الله هزوا" (مصنف ابن ابی شیبہ: کتاب الطلاق، باب فی الرجل یطلق أمرأتہ مائۃ أوألفا، حدیث نمبر: ۱۷۸۰۴)۔

(ایک صاحب حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے پاس آئے اور انہوں نے کہا: میں نے اپنی بیوی کو گیارہ سو طلاق دے دی، حضرت عبداللہ بن عباس نے فرمایا: وہ تین طلاق کی بنا پر تم سے بائنہ ہوگئی، اور یہ سب کی سب گناہ ہیں، تم نے اللہ کے احکام کو مذاق بنالیا)۔

۷-"جاء رجل إلى عبد الله بن عمر، وأنا عنده فقال: يا أبا عبدالرحمن، إنه طلق أمرأته مائة مرة، قال بانت منک بثلاث وسبعة وتسعون يحاسبک الله بها يوم القيامة" (مصنف ابن ابی شیبہ: کتاب الطلاق، باب فی الرجل یطلق أمرأتہ مائۃ أوألفا، حدیث نمبر ۱۷۸۰۷)۔

(سعید مقبری نقل کرتے ہیں کہ حضرت عبد اللہ بن عمرؓ کے پاس ایک صاحب آئے، جبکہ میں ان کے پاس موجود تھا، انہوں نے کہا: اے ابوعبدالرحمٰن! اس نے اپنی بیوی کو سو طلاق دے دی ہے، انہوں نے جواب دیا: تین طلاق کے ذریعہ رشتہ نکاح ختم ہوگیا اور ستانوے طلاقوں کا اللہ تعالیٰ تم سے حساب لیں گے)۔

ان آثار صحابہ سے صاف واضح ہے کہ طلاق دینے والوں نے مغلوب الجذبات ہوکر یہ طلاق دی؛ ورنہ تین کے بجائے ہزار یا گیارہ سو طلاقیں نہ دیتے، اور جب ان کے طلاق دینے کے بارے میں دریافت کیا گیا تو صحابہ نے سیدھے طلاق کے واقع ہوجانے کی بات فرمائیں، یہ دریافت نہیں کیا کہ کیا تم نے پہلے حکم کے ذریعہ مسئلہ کو حل کرنے کی کوشش کی تھی؟...... پھر یہ بات قابل توجہ ہے کہ ان میں بعض آثار خلفاء راشدین یعنی حضرت عمر، حضرت عثمان اور حضرت علیؓ کے ہیں، اور ایک اثر خانوادہ نبوت کی اہم شخصیت

حضرت حسنؓ کا ہے؛ جن کو پانچواں خلیفہ راشد بھی قرار دیا جاتا ہے، اور تین آثار حضرت عبداللہ بن مسعود، حضرت عبدالل ہ بن عباس اور حضرت عبداللہ عمرؓ جیسے اکابر صحابہ کے ہیں، جو صحابہ کے درمیان علم وتفقہ میں ممتاز حیثیت کے حامل تھے۔

اجماع

کتاب وسنت کے بعد شریعت کا تیسرا ماٴخذ ''اجماع'' ہے، یعنی امت کے مجتہدین جس بات پر اتفاق کرلیں، وہ بات حجت ہے، اس وقت اہل سنت والجماعت کے پانچ مکاتب فکر ساری دنیا میں پائے جاتے ہیں: حنفی، شافعی، مالکی، حنبلی اور سلفی، نیز اہل تشیع کے یہاں فقہ جعفری پر عمل ہے، ان دونوں کے علاوہ دو اور فقہی مکاتب پائے جاتے ہیں، فقہ زیدی (جس کے ماننے والے زیادہ تر یمن میں ہیں)، اور فقہ اباضی (جس پر سلطنت مسقط کا عمل ہے) ان تمام مکاتب فقہ کی کتابیں چھپی ہوئی موجود ہیں، ان میں سے کسی کے یہاں بھی طلاق واقع ہونے کے لئے مصالحتی کوشش کا ضروری ہونا شرط نہیں ہے، خود صحابہ وتابعین اور وہ مجتہدین جن کی فقہ مستقل دبستان قانون نہیں بن سکی، جیسے: سفیان ثوری، اوزاعی، حسن بصری، لیث بن سعد، ابن جریر طبری، داوٴد ظاہری رحمہم اللہ اجمعین وغیرہ کے اجتہادات کو بھی موجودہ دور میں بعض محققین نے یکجا کیا ہے؛ لیکن کسی کے یہاں طلاق واقع ہونے کے سلسلہ میں ایسی کسی شرط کا ذکر نہیں ملتا؛ حالانکہ اگر طلاق کے واقع ہونے کے لئے پہلے تحکیم کے مرحلہ سے گذرنا ضروری ہوتا، تو فقہاء دوسری شرائط کے ساتھ ساتھ ضرور اس کا ذکر فرماتے؛ بلکہ اہمیت کے اعتبار سے اس کو زیادہ زور دے کر کہا گیا ہوتا؛ اس لئے اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اس بارے میں امت کا اجماع واتفاق ہے۔

قیاس

قانون شریعت کا چوتھا ماٴخذ ''قیاس'' ہے، یعنی جو مسئلہ قرآن وحدیث میں نہ آیا

ہو،مگر اس کی نظیر قرآن وحدیث میں مل جائے تو جو حکم اس میں دیا گیا ہے، وہی حکم اس مسئلہ کا بھی مقرر کیا جائے، اس نقطہ نظر سے یہ بھی زائد شرط معتبر نظر نہیں آتی، طلاق کی مماثل صورتیں ''خلع، ایلاء، اعان اور فسخ'' کی ہیں، خلع میں عورت کے مطالبہ پر طلاق دی جاتی ہے، ایلاء یہ ہے کہ کوئی مرد چار ماہ تک بیوی سے تعلق نہ رکھنے کی قسم کھائے، اس صورت میں چار ماہ گذرنے پر طلاق واقع ہوجاتی ہے، لعان یہ ہے کہ شوہر بیوی پر برائی کی تہمت لگائے اور عورت کو اس کا اقرار نہ ہو اور عدالت ان کو علاحدہ کردے، علاحدگی کی پہلی تینوں صورتوں (خلع، ایلاء، لعان) کا ذکر قرآن مجید میں موجود ہے، اور قاضی کے ذریعہ فسخ و تفریق کا ذکر حدیث میں آیا ہے، ان میں سے کسی بھی صورت میں زوجین کے درمیان علاحدگی کی ایک صورت ہے؛ لہذا قیاس کا تقاضا یہی ٹھہرا کہ ان امور کی طرح طلاق واقع ہونے کے لئے بھی پہلے ثالث کے ذریعہ معاملہ طے کرنے کی کوشش کرنا ضروری نہیں ہو۔

قانونی واخلاقی احکام کا فرق

ہر قانون میں کچھ احکام اخلاقی ہوتے ہیں اور کچھ قانونی، خاص کر مذاہب میں ایک بڑا حصہ اخلاقی قانون پر مشتمل ہوتا ہے، بڑوں کا احترام، چھوٹوں کے ساتھ شفقت، دوسروں کا بوجھ اٹھانے میں مدد کرنا، اور پڑوسیوں کو بھوکا نہ رہنے دینا وغیرہ، کتنے ہی احکام ہیں جو اخلاقیات میں سے ہیں، ان کو قانون کا درجہ حاصل نہیں۔

نکاح وطلاق سے متعلق بھی بہت سے اخلاقی قوانین ہیں، مثلاً یہ کہ ایسے طہر میں طلاق نہ دی جائے، جس میں شوہر بیوی سے قربت کر چکا ہے، اسی طرح حالت حیض میں طلاق نہیں دی جائے؛ لیکن اگر طلاق دے ہی دے تو گو یہ فعل گناہ کا ہوگا، لیکن طلاق واقع ہوجائے گی، خود حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے جس واقعہ کا ذکر آیا ہے کہ انہوں نے اپنی بیوی کو

حالت حیض میں طلاق دے دی، ان کی طلاق کو طلاق شمار کیا گیا، حدیث میں اس کی صراحت موجود ہے:

”وكان عبد الله طلقها تطليقة واحدة فحسبت من طلاقها“(رواہ مسلم، حدیث نمبر:۱۴۷۱)۔

پس مصالحانہ تدبیروں کے سلسلہ میں قرآن کے جن احکام کا اوپر ذکر آ چکا ہے، وہ اولاً تو خاص طلاق سے متعلق نہیں ہیں؛ بلکہ ان کا تعلق ازدواجی زندگی کے تمام ہی مسائل سے ہے، دوسرے یہ احکام اخلاقی نوعیت کے ہیں، یہ شرط کے درجہ میں نہیں ہیں کہ جب تک ان مراحل کی تکمیل نہ ہو جائے طلاق واقع ہی نہ ہو۔

تحکیم کا طلاق سے متعلق ہے؟

عدالتیں جن آیات سے اس سلسلہ میں استدلال کر رہی ہیں، وہ یہ ہیں:

”الرجال قوامون على النساء بما فضل الله بعضهم على بعض وبما انفقوا من أموالهم فالصالحات قانتات حافظات للغيب بما حفظ الله والاتى تخافون نشوزهن فعظوهن واهجروهن فى المضاع واضربوهن فإن اطعنكم فلا تبغوا عليهن سبيلا إن الله كان عليا كبيرا—وإن خفتم شقاق بينهما فابعثوا حكما من اهله وحكما من اهلها ان يريد اصلاحا يوفق الله بينهما إن الله كان عليما خبيرا“(نساء:۳۴-۳۵)۔

(مرد عورتوں پر نگراں ہیں؛ اس لئے کہ مردوں نے اپنے مال خرچ کئے ہیں، پس نیک عورتیں فرماں بردار ہوتی ہیں، اور شوہر کی عدم موجودگی میں جیسا کہ اللہ نے محفوظ رکھا ہے، اپنی (عزت وآبرو اور مال) کی حفاظت کرتی ہیں، اور جن عورتوں کی نافرمانی کا تمہیں

اندیشہ ہو، ان کو نصیحت کرو، ان سے بستر الگ کرلو، اوران کی سرزنش کرو، اگر وہ فرمانبرداری کریں تو ان پر (زیادتی کا) راستہ تلاش نہ کرو، بے شک اللہ بلندی اور بڑائی والے ہیں، اور اگر تم کو میاں بیوی کے درمیان اختلاف کا اندیشہ ہو تو ایک حکم مرد کے خاندان سے اور ایک حکم عورت کے خاندان سے مقرر کرو، اگر یہ دونوں صلح کرانا چاہیں گے تو اللہ ان کے درمیان جوڑ پیدا کردیں گے، بے شک اللہ تعالیٰ علم والے اور باخبر ہیں)۔

ان آیات میں مرد وعورت کا مقام بتایا گیا ہے کہ مرد صدر خاندان ہے، اور عورت پر جائز امور میں اس کی اطاعت واجب ہے؛ چونکہ حقوق اور فرائض کے بارے میں اکثر نزاع پیدا ہوجاتی ہے، اور میاں بیوی کی ہمہ وقتی رفاقت کی وجہ سے ان کے درمیان نزاع کا امکان زیادہ ہوتا ہے؛ اس لئے خاص طور پر میاں بیوی کے بارے میں بتایا گیا کہ اگر بیوی شوہر کے حقوق کے بارے میں کوتاہی کرے، اور اس کی وجہ سے تعلقات میں ناخوشگواری پیدا ہونے کا اندیشہ ہو تو پہلے شوہر ذاتی طور پر اس کو حل کرنے کی کوشش کرے، اور اس کی تین صورتیں ہوسکتی ہیں:

الف- پند ونصیحت کے ذریعہ سمجھانا۔

ب- عارضی طور پر ترک تعلق۔

ج- معمولی سرزنش۔

اور اگر اس سے مسئلہ حل نہ ہو تو سماج کو چاہئے کہ باہمی جھگڑے طے کرنے کے لئے دونوں خاندان سے ایک ایک حکم لے کر اختلاف کو ختم کرانے کی کوشش کرے۔

یہ پورا مضمون ان ہی دو آیتوں میں آیا ہے، نہ اس سے پہلے دور تک طلاق کا ذکر ہے نہ اس کے بعد، اگر یہ آیت طلاق سے متعلق ہوتی تو اس ارشاد کے ساتھ طلاق کا بھی

ذکر آتا، یہ تو ایک عمومی نصیحت ہے؛ چونکہ ازدواجی رشتہ خاندان کے استحکام کے لئے خصوصی اہمیت کا حامل ہے؛اس لئے خاص طور پر ذکر کیا گیا ہے کہ اس میں دراڑ پیدا نہیں ہونی چاہئے،شوہر بھی ذاتی طور پر اس کے لئے کوشش کرے،اور سماج بھی اس سلسلہ میں اپنا کردار ادا کرے،اس کا تعلق خاص طلاق کے مسئلہ سے نہیں ہے؛ بلکہ یہ اس بات کی تعلیم ہے کہ کسی بھی قسم کا اختلاف میاں بیوی میں پیدا ہو تو اسے اسی طریقہ پر حل کرنے کی کوشش کی جائے۔

اس آیت کے پس منظر میں زوجین کو نصیحت کی جاسکتی ہے کہ طلاق میں عجلت نہیں کرنی چاہئے؛ بلکہ اگر تعلقات میں ناخوشگواری پیدا ہو جائے تو اس کو حل کرنے کی مخلصانہ کوشش کی جائے،اور آخری چارہ کار کے طور پر ہی طلاق دی جائے؛لیکن اس کی حیثیت طلاق کے لئے شرط کی نہیں ہے اور غور کریں تو......آیتوں میں جن مراحل کا ذکر کیا گیا ہے ان میں تین (پند ونصیحت،ترک تعلق،معمولی سرزنش) تو وہ ہیں،جن کا تعلق شوہر اور بیوی کی خلوت سے ......ان کو تو عدالت کے سامنے ثابت کرنا بھی دشوار ہے،اگر ان دونوں آیتوں میں آنے والے احکام کو طلاق کے مسئلہ سے جوڑا جائے،اور طلاق واقع ہونے کے لئے طلاق سے پہلے ان امور کو پورا کرنا شرط قرار دیا جائے تو عدالت میں طلاق کے واقع ہونے کی بات کو ثابت کرنا شاید ناممکن ہو جائے۔

۳-کیا تحکیم لازم قرار دینا عورتوں کے مفاد میں ہے؟

یہ بات بادی النظر میں بہتر معلوم ہوتی ہے کہ طلاق کا فیصلہ آخری چارہ کار کے طور پر کیا جائے،اس سے پہلے باہمی صلح وصفائی کی تدبیریں کی جائیں،انہیں تدبیروں میں سے ایک یہ ہے کہ اگر زوجین آپس میں مسئلہ کو حل نہ کرسکیں تو خاندان کے بزرگوں، یا سماج

کے کسی اور ذمہ دار شخص کے ذریعہ نزاع کو سلجھانے کی کوشش کریں، قرآن نے اگرچہ ثالثی سے طلاق کو مربوط نہیں کیا ہے؛ لیکن زوجین کے اختلاف حل کرنے کی مختلف تدبیریں بتائی ہیں، ان میں ایک تدبیر یہ بھی ہے، جس کا سورہ نساء کی آیت نمبر ۳۴، ۳۵ میں ذکر آیا ہے؛ البتہ اس کو لازم قرار نہیں دیا گیا ہے، اور نہ طلاق کے معتبر ہونے کے لئے اس کو شرط کا درجہ دیا گیا ہے۔

غور کیا جائے تو اس کو لازم نہ کرنے میں عورتوں ہی کا مفاد ہے؛ کیونکہ طلاق زندگی کا بند دروازہ نہیں، جس کے آگے کوئی راستہ نہ ہو؛ بلکہ یہ ایک مرحلہ کا اختتام ہے اور دوسرے مرحلہ کا آغاز ہے، طلاق کے ذریعہ زندگی کا ایک باب بند ہوتا ہے اور دوسرا کھلتا ہے، عورت کا پہلا رشتۂ نکاح ختم ہوجاتا ہے اور دوسرے نکاح کی راہ ہموار ہوتی ہے، اگر شوہر پر یہ بات لازم قرار دی جائے کہ وہ ان اسباب وجوہ کی وضاحت کرے، جن کی وجہ سے اس نے طلاق دی ہے تو ہوسکتا ہے کہ بہت سی دفعہ ان کا ظاہر کرنا خود عورت کے مفاد میں نہ ہو، ایسے مواقع پر ایک شریف اور باعزت میاں بیوی اس بات کو بہتر سمجھتے ہیں کہ علاحدگی ہوجائے اور ایسے واقعات پردہ ہی میں رہیں؛ تاکہ کسی فریق کی بے عزتی اور بے آبروئی نہ ہو، اور اگر طلاق کا سبب عورت کی طرف سے پائی جانے والی کوتاہیاں نہ ہوں، تب بھی اس بات کا قوی اندیشہ ہے کہ خدا ناترس شوہر جھوٹ بولے اور اپنی بیوی کے کردار پر حملہ کرے؛ تاکہ طلاق دینے کے عمل کو درست ثابت کرسکے، ہر دو صورت میں عورت کے لئے آئندہ زندگی کا آغاز مشکل ہوجائے گا، جب سماج تک یہ بات پہنچے گی کہ فلاں شخص کی بیوی پر بدکردار، بداخلاق، بدزبان اور نافرمان ہونے کا الزام ہے تو غور کیجئے کہ کوئی شخص اس کو اپنی بیوی یا بہو بنانے کو تیار ہوگا؟ ہندوستان کے موجودہ معاشرہ کی صورت حال یہ ہے

کہ کنواری لڑکیوں کا رشتہ ملنا دشوار ہوتا ہے، وہاں کیا ایسی مطلقہ عورتوں کا رشتہ ملنا آسان ہوگا ، جن کی کمزوریاں طشت از بام ہوچکی ہو، یا وہ ہوں تو بے قصور؛ لیکن انہیں بدنام کردیا گیا ہو؟اس لئے حقیقت یہ ہے کہ طلاق سے پہلے تحکیم کوضروری قرار دینا نتیجہ کے اعتبار سے عورت کے لئے نقصان دہ ہے نہ کہ فائدہ مند۔

☆☆☆

نفقہ مطلقہ کا مسئلہ

شریعت اور انصاف کے آئینہ میں

ایک دہائی سے زیادہ عرصہ سے نفقہ مطلقہ کا مسئلہ بحث ونظر کا موضوع بنا ہوا ہے، شاہ بانو کیس نے پورے ملک میں جو ہلچل پیدا کی تھی، اور اس مسئلہ کے پس منظر میں تحفظ شریعت کی تحریک نے جس طرح پورے ملک کے مسلمانوں کو بیدار کیا تھا، اور احکام شریعت کو سمجھنے اور اس کی معاشرتی اہمیت کا مطالعہ کرنے کا جو شعور پیدا کیا تھا، وہ یقیناً مسلمانان ہند کی دینی اور ملی تاریخ یا ایک روشن باب ہے، اسی کے نتیجہ میں ''تحفظ حقوق مسلم خواتین بل'' پاس ہوا، مسلمان توقع رکھتے تھے کہ یہ قانون اس مسئلہ میں مسلمانوں کی بے چینی اور ضطراب کا مداوا کرے گا؛ لیکن افسوس کہ اس قانون کی ہماری بعض عدالتوں نے ایسی تشریح کی، جس نے اس قانون کے بنیادی مقصد ہی کو مجروح کرکے رکھ دیا، اور ایسی تشریحات کی گئیں جو ''قانون کی تشریح'' سے آگے بڑھ کر ''قانون وضع'' کرنے کے دائرہ میں آتی ہیں، اس طرح کے فیصلوں نے یقیناً مسلمانوں کے مذہبی جذبات کو ٹھیس پہنچائی ہے، بعض بھولے بھالے اور قانون کی روح اور مضمرات سے ناواقف غیر مسلم بھائی تو کیا، مسلمان بھی مطلقہ کے لئے نفقہ کے حق کو ایک جائز اور انسانی حق باور کرتے ہیں؛ حالانکہ نہ صرف اسلامی بلکہ عقلی نقطۂ نظر سے یہ بات ناقابل فہم ہے۔

نفقہ واجب ہونے کے اسلامی اصول

جہاں تک قانون شریعت کی بات ہے تو شریعت میں ایک شخص کا نفقہ دوسرے شخص پر تین وجوہ میں سے کسی ایک وجہ سے واجب ہوتا ہے:۱-قرابت، ۲-حبس، ۳-ملکیت۔

ماں باپ، بال بچے، بھائی بہن، دادا، دادی، اور بعض حالات میں دوسرے اعزہ اور رشتہ داروں کا نفقہ قرابت کی وجہ سے واجب ہوتا ہے، قرابت کی بناء پر نفقہ واجب قرار دیئے جانے کے سلسلہ میں دو اصول بنیادی اہمیت رکھتے ہیں، ایک یہ کہ قرابت کی بنا پر اس شخص کا نفقہ واجب ہوگا، جو خود اپنی کفالت سے قاصر ہو، دوسرے اس شخص پر واجب ہوگا، جو اتنا خوش حال ہو کہ ضروری حد تک اپنی ضروریات پوری کر کے اس شخص کی کفالت بھی کر سکتا ہو۔

ملکیت کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص کسی چیز کا مالک ہو، اس کا نفقہ اس پر واجب ہوگا، جب غلام اور باندی کا وجود تھا تو اسی بنیاد پر مالک پر غلام اور باندی کا نفقہ واجب قرار دیا جاتا تھا، اسی طرح اسلام جانوروں کا نفقہ ان کے مالک پر واجب قرار دیتا ہے، اگر کوئی شخص اپنے جانوروں کا چارہ فراہم نہ کر سکے تو اس کے لئے یہ حکم ہے کہ اگر حلال جانور ہو تو یا تو ذبح کر کے کھا لے یا فروخت کر دے، اور حرام جانور ہو تو اسے بہر حال فروخت کر دے، اس کو بھوکا رکھ کر یوں ہی اپنی ملکیت میں رکھنا جائز نہیں، اور دیانت و اخلاق کے اخلاف ہے۔

''حبس'' کے معنی ہیں روکے رکھنا، یعنی اگر ایک شخص دوسرے شخص کی وجہ سے محبوس ہو، پابندی کی حالت میں ہو اور معاشی سرگرمیاں اختیار نہیں کر سکتا ہو تو اس کا نفقہ اس

شخص پر واجب ہوگا جس کی وجہ سے وہ پابندی اور حبس کی حالت میں ہے، ملازمین اور مزدوروں کی تنخواہ گورنمنٹ اور آجرین پر اسی لئے واجب ہے؛ کیونکہ وہ سرکار اور آجر کے لئے محبوس ہیں۔

بیوی کا نفقہ شوہر پر اسی جہت سے واجب ہوتا ہے، بیوی گھر کی دکھ بھال، بال بچوں کی پرورش اور امور خانہ داری کے لئے گویا محبوس ہوتی ہے؛ اس لئے شوہر کے ذمہ اس کا نفقہ واجب رکھا گیا ہے، حبس کی وجہ سے جو نفقہ واجب ہوتا ہے، اس کے سلسلہ میں اصول یہ ہے کہ محبوس و پابند شخص غریب وتنگ دست ہو یا معاشی اعتبار سے خوش حال وخود مکتفی، اور اسی طرح وہ جس شخص کے لئے محبوس ہے، اس کی معاشی حالت اچھی ہو یا معمولی، بہر صورت نفقہ واجب ہوگا۔

پھر جب ایک عورت اپنے شوہر سے مطلقہ ہوجاتی ہے، تو عدت گذرنے کے بعد وہ اپنے سابق شوہر کے لئے محبوس نہیں، دوسرا نکاح کرسکتی ہے، اور شریعت کے دائرہ میں رہتے ہوئے معاشی سرگرمی بھی اختیار کرسکتی ہے، اس لئے کہ اس کو نہ سابق شوہر سے اجازت حاصل کرنے کی ضرورت ہے اور نہ سابق شوہر کو اس کو ملازمت یا کسی اور بات سے روکنے کا حق ہے؛ اس لئے اب ''حبس'' کی وجہ سے نفقہ واجب ہونے کی کوئی وجہ نہیں، نیز یہ بات بھی ظاہر ہے کہ طلاق واقع ہونے کے بعد اپنے سابق شوہر سے اس کی کوئی قرابت باقی نہیں رہی؛ کیونکہ ازدواجی رشتہ خونی رشتوں کی طرح اٹوٹ رشتہ نہیں ہے؛ بلکہ ایک رشتہ ہے جو زبان کے بول سے وجود میں آتا ہے اور زبان کے بول ہی سے ختم بھی ہوجاتا ہے؛ اس لئے طلاق کے بعد میاں بیوی میں کوئی قرابت باقی نہیں رہتی- جہاں تک ملکیت کی بات ہے تو اسلام کی نگاہ میں شوہر و بیوی نکاح کے دو فریق اور زندگی میں ایک دوسرے

کے رفیق ہیں نہ کہ مالک اورمملوک، اسلام سے پہلے عورت کو بعض سماج میں مرد کی ملکیت اور جائداد تصور کیا جاتا تھا، اسلام نے اس تصور کو مٹا دیا اور کہا کہ جیسے مردوں کے عورتوں پر حقوق ہیں، اسی طرح عورتوں کے مردوں پر ہیں:

''**ولهن مثل الذی علیهن بالمعروف**''(بقرہ:۲۲۸)۔

غرض کہ اسلامی قانون کے نقطۂ نظر سے طلاق اور عدت گذرنے کے بعد کوئی ایسی بنیاد باقی نہیں رہتی، جس کی وجہ سے مرد پر اس عورت کا نفقہ واجب قرار دیا جائے۔

ہندو مذہب میں حقیقی تصور یہی تھا کہ بیوی شوہر کی ملکیت ہوتی ہے، اور ایک عورت کو ہمیشہ اسی شوہر کے ساتھ بندھا رہنا ہے، وہ اپنے آپ کو اس کی قید نکاح سے آزاد نہیں کرسکتی، غالباً اسی تصور نے ''ستی'' کے رواج کو جنم دیا، کہ جب شوہر مر جائے تو عورت بھی اس کے ساتھ نذر آتش کردی جائے، پس، چونکہ ہندو سماج میں عورت کے مطلقہ ہونے کا تصور نہیں؛ اس لئے مطلقہ سے متعلق احکام کا بھی وجود نہیں؛ اسی لئے برادران وطن کے لئے یہ بات حیرت انگیز ہوسکتی ہے کہ کوئی عورت جب ایک بار نکاح میں آ چکی ہو تو پھر وہ نکاح کی وجہ سے واجب ہونے والے نفقہ سے کیوں کر محروم ہوسکتی ہے؟ لیکن اسلام میں نکاح کا ایک اعلیٰ تصور ہے کہ شوہر و بیوی ایک معاہدہ کے تحت ازدواجی رشتہ کے بندھن میں بندھتے ہیں، اور بڑی حد تک مساوی حیثیت کے مالک ہیں، پھر جب کسی ایک کی خواہش پر نکاح ختم ہوجائے تو وہ اپنی اپنی زندگی کے بارے میں آزاد ہیں، دونوں کی اس حیثیت کے پس منظر میں دیکھا جائے تو یہ بالکل معقول بات ہے کہ جب مرد و عورت کے درمیان ازدواجی رشتہ ہی باقی نہیں رہا تو اس مرد پر اس عورت کا نفقہ کیوں کر واجب ہوگا؟

عقل و مصلحت کا پہلو

خالص عقلی اور سماجی مصالح کے نقطۂ نظر سے بھی مرد پر مطلقہ کا نفقہ واجب قرار دینا

نامناسب بات ہے اور اس سلسلہ میں چند امور کو پیش نظر رکھنے کی ضرورت ہے:

۱-اگر مرد کو یہ معلوم ہو جائے کہ اپنی بیوی کو طلاق دینے کی صورت میں اسے زندگی بھر نفقہ دیتے رہنا پڑے گا تو جو مرد اپنی بیوی سے رشتہ ختم کرنا چاہتا ہو، اس میں نفرت کے جذبات مزید بڑھیں گے، اس زندگی بھر کی سزا سے نجات پانے کے لئے وہ غیر قانونی راستے اختیار کرے گا، اور بجائے طلاق دینے کے بیوی کی زندگی کے درپے ہو جائے گا، اور اس طرح کے واقعات پیش آئیں گے، جو روز ہمارے یہاں اخبارات کی سرخیاں بنتی رہتی ہیں، قانونی راستے کو اتنا مشکل، دشوار اور تکلیف دہ نہ بنانا چاہئے کہ لوگ غیر قانونی راستے اختیار کرنے پر مجبور ہو جائیں۔

۲-طلاق کے بعد بھی نفقہ واجب قرار دینے کا ایک منفی اثر یہ مرتب ہوسکتا ہے کہ مغربی ملکوں کی طرح ہمارے ملک میں بھی نکاح کی شرح کم ہوتی جائے، مغربی ممالک میں طلاق کو ایک مشکل عمل بنا دیا گیا اور طلاق کی صورت میں مرد پر ڈھیر سارے واجبات عائد کر دیئے گئے، اس کی وجہ سے وہاں نکاح کی شرح گھٹتی جارہی ہے، مثلاً درج ذیل اعداد و شمار ملاحظہ کئے جاسکتے ہیں:

	ممالک	2010	2009	2000	1990	1980	1970	1960
۱-	آسٹریا	4.5	4.2	4.9	5.9	6.2	7.1	8.3
۲-	بلجیم	3.9	4.0	4.4	6.5	6.7	7.6	7.1
۳-	ڈنمارک	5.6	6.0	7.2	6.1	5.2	7.5	7.8
۴-	فرانس	3.9	3.9	5.0	5.1	6.2	7.8	7.0
۵-	جرمنی	4.7	4.6	5.1	6.5	6.3	7.5	9.5

۶-	یونان	5.0	5.2	4.5	5.8	6.5	7.0	7.7
۷-	ہالینڈ	4.5	4.4	5.5	6.5	6.4	9.5	7.7
۸-	اٹلی	3.6	3.8	5.0	5.6	5.7	7.3	7.7
۹-	پرتگال	4.7	4.9	4.8	7.6	7.9	7.9	7.8
۱۰-	اسپین	3.6	3.8	5.4	5.7	5.9	7.3	7.8
۱۱-	سویڈن	5.3	5.1	4.5	4.7	4.5	5.4	6.7
۱۲-	برطانیہ	4.5	4.3	5.2	6.6	7.4	8.5	7.5

۳- بدقماش اور بیمار ذہن عورتیں کوشش کریں گی کہ شوہر کو اس طرح پریشان کریں کہ وہ طلاق دینے پر مجبور ہو جائے اور پھر اپنی مفسدانہ حرکتوں میں مشغول رہیں گی؛ چنانچہ ایسے واقعات سامنے آئیں کہ ایک مطلقہ عورت اپنے آشنا کے ساتھ علانیہ عدالت میں آتی ہے اور سابق شوہر سے نفقہ وصول کر کے لے جاتی ہے، کیا اسے سماجی انصاف کہا جا سکتا ہے؟ بلکہ ایسا بھی ممکن بھی ہے کہ بعض بدقماش عورتیں سابق شوہر سے نفقہ حاصل کرنے اور آتش انتقام ٹھنڈی کرنے کی غرض سے دوسرے نکاح سے احتراز کریں، اور بے راہ روی کو ترجیح دیں۔

۴- آخر ایک شخص کا نفقہ دوسرے پر واجب قرار دینے کے لئے کوئی بنیاد و اساس تو ہونی چاہئے، اگر اجیر اور آجر کے درمیان اجارہ ختم ہونے کے بعد ایک پر دوسرے کے واجبات عائد نہیں ہوتے، ملازمت ختم ہونے کے بعد ملازم تنخواہ کا مستحق نہیں ہوتا، تو یہ کون سی منطق ہے کہ ایک مرد و عورت کے درمیان نکاح کا رشتہ باقی نہیں رہا؛ لیکن مرد نفقہ ادا کرتا رہے؟ -اور پھر کیا کوئی غیرمند شریف عورت اس بات کو گوارا کرسکتی ہے کہ ایک اجنبی اور بے تعلق شخص کے لقموں پر اس کی پرورش ہو، اور ایک ایسے شخص کے سہارے وہ زندگی

گزارے، جس نے اسے رد کر دیا ہے، اس لئے حقیقت یہ ہے کہ عقل اور سماجی مصلحت کا تقاضا بھی یہی ہے کہ مطلقہ کا اس کے سابق شوہر پر نفقہ واجب نہیں ہونا چاہئے۔

مسئلہ کا حل

لیکن کیا اسلام نے ایسی عورتوں کو بے سہارا کر دیا ہے؟ ہرگز نہیں،- اس سلسلہ میں چند نکات کو ملحوظ رکھنا چاہئے:

الف- اسلامی نقطہ نظر سے نکاح کی وجہ سے عورت کا رشتہ اپنے خاندان سے منقطع نہیں ہوتا؛ اسی لئے وہ اپنے ماں باپ اور بعض اوقات بھائی اور چچا وغیرہ سے میراض کی حق دار ہوتی ہے، جب کوئی عورت مطلقہ ہو جائے تو اب اس کے والدین اور قریبی محرم رشتہ داروں پر حسب مراتب اس کا نفقہ واجب ہوتا ہے، اس سلسلہ میں اصول یہ ہے کہ اگر اس خاتون کا انتقال ہو جائے تو جو لوگ شرعاً اس کے وارث ہوں گے، ان ہی اعزہ پر اس کا نفقہ واجب ہوگا۔

ب- اکثر طلاق کے وقت مہر کی صورت میں ایک خطیر رقم ملتی ہے، جسے وہ کاروبار میں شریک کر کے کچھ گذران حاصل کر سکتی ہے۔

ج- اگر اس کی پرورش میں طلاق دینے والے شوہر کے بچے اور بچیاں ہیں تو بچوں کی عمر آٹھ سال ہونے تک اور لڑکیوں کی عمر بالغ ہونے تک ماں پرورش کی حقدار ہے، اس عرصہ میں وہ سابق شوہر سے اس کے بچوں کی پرورش کرنے کی اجرت وصول کر سکتی ہے، یہ نفقہ نہیں ہے، بلکہ اس کی محنت کا معاوضہ ہے۔ یہ اجرت حضانت اتنی ہونی چاہئے کہ بچہ کی پرورش کرنے والی عورت کے کھانے پہننے اور رہائش کی ضرورت پوری ہو جائے، فقہاء نے اس کی صراحت کی ہے:

......

د-سب سے اہم بات یہ ہے کہ اسلام نے ایسی خواتین کے نکاح ثانی کا حکم دیا ہے:"**أنکحوا الأیامی منکم**" (نور:۳۲)اس لئے سرپرستوں کا شرعی فریضہ ہے کہ وہ کنواری لڑکیوں کی طرح ان کے نکاح کی بھی فکر کریں۔

غرض کہ ہرگز ایسا نہیں ہے کہ اسلام نے ایسی عورت کو محروم اور بے آسرا رکھا ہو۔

لیکن قانون کے فوائد اور نقصانات کا تعلق بہت کچھ قانون پر عمل کرنے والوں کے صحیح اور غلط رویہ سے بھی ہوتا ہے، مسلمانوں کی ذمہ داری ہے کہ وہ مطلقہ عورتوں کے نکاح کو رواج دیں، ہندو معاشرہ کی طرح ایسی خواتین کو منحوس نہ سمجھیں، سارے مسئلہ کی اصل جڑ یہی ہے، عرب معاشرہ میں آج بھی مطلقہ کا کوئی مسئلہ نہیں، اور طلاق کے واقعہ کو چنداں دشوار نہیں سمجھا جاتا؛ کیونکہ وہاں طلاق شدہ عورتوں کا نکاح کوئی دشوار بات نہیں؛ بلکہ عدت گذرتے گذرتے پیام آنے شروع ہوجاتے ہیں؛اسی لئے دونوں خاندانوں میں اس طرح کی تلخی بھی پیدا نہیں ہوتی، جو ہندوستان میں دیکھنے میں آتی ہے- دوسرے ہماری محبت اور حسن سلوک کا دائرہ اتنا سمٹ گیا ہے کہ ہم "اپنے اور اپنے بچوں" کے سوا کسی کی ذمہ داری محسوس نہیں کرتے ، یہاں تک کہ بعض لوگ تو بوڑھے ماں باپ کو بھی بوجھ سمجھنے لگے ہیں، ان حالات میں مطلقہ عورتوں کے تئیں ذمہ داریوں کے احساس کی کیا خاک توقع رکھی جاسکتی ہے؟ اس لئے یہ بات بہت ضروری ہے کہ مسلم سماج میں اس احساس کو جگایا جائے اور لوگوں کے ضمیر کو جھنجھوڑا جائے کہ ایسی بے کس و بے آسرا عورتوں کی ضروریات کی کفالت بھی ہماری ذمہ داری ہے، اور یہ احسان نہیں؛ بلکہ ایک حق کی ادائیگی ہے!

لے پالک (Adopted Child) کا مسئلہ
شریعت اور عقل کی روشنی میں!

مسلم پرسنل لا سے متعلق جن مسائل پر بحث کی جاتی ہے، ان میں ایک ''متبنی'' یعنی ''لے پالک'' کا مسئلہ بھی ہے، عربی زبان میں بیٹے کو ''ابن'' کہتے ہیں اور جو بیٹا نہ ہو، مگر اس کو بیٹا بنالیا گیا ہو، اس کو ''متبنی'' کہتے ہیں، دنیا کی مختلف قوموں اور نظام ہائے قانون میں ''متبنی'' بنانے کی گنجائش تسلیم کی گئی ہے، یونانیوں اور رومیوں کے بارے میں نقل کیا جاتا ہے کہ ان کے یہاں بھی ''متبنی'' کا تصور تھا، ہندو بھائیوں کے یہاں اس کا تصور موجود ہے اور ان کے یہاں اس کا خاص سبب یہ ہے کہ ان کے عقیدہ کے مطابق انسان کی مکتی (نجات) اس بات سے متعلق ہے کہ بیٹا اس کی چتا (لاش) کو آگ لگائے؛ اس لئے کسی کو اگر اولاد نرینہ نہیں ہوتی ہے تو وہ کسی اور لڑکے کو ''متبنی'' لے کر اس ضرورت کو پوری کرتا ہے۔

زمانہ جاہلیت میں

محمد رسول اللہ ﷺ حجاز میں مبعوث کئے گئے اور یہیں آپ ﷺ کی نبوت کا آفتاب طلوع ہوا، عربوں میں بھی اسلام سے پہلے متبنی بنانے کا تصور موجود تھا اور اس سلسلہ میں کم سے کم چار واقعات ناموں کی صراحت کے ساتھ ملتے ہیں۔

ان میں ایک واقعہ تو حضرت زید بن حارثہؓ کا ہے، خود رسول اللہ ﷺ سے متعلق

ہے اور قرآن مجید میں اس کا ذکر آیا ہے، حضرت زید بن حارثہ بن شرحبیل الکلبیؓ کو زبردستی مکہ کے بعض قافلوں نے اغوا کر کے بیچ دیا تھا، بعد میں ان کو ام المؤمنین حضرت خدیجہؓ نے خرید لیا، جب رسول اللہ ﷺ کا نکاح حضرت خدیجہؓ سے ہوا، تو انہوں نے حضرت زیدؓ کو آپ ﷺ کی ملکیت میں دے دیا، حضرت زیدؓ نے بڑی ہی محبت اور جانثاری کے ساتھ آپ ﷺ کی خدمت کی، اور جب ان کے والد اور چچا انہیں اپنے قبیلہ میں واپس لے جانے کے لئے آئے اور آپ ﷺ نے اپنی طرف سے انہیں اجازت دے دی، تب بھی انہوں نے اپنے خاندان کے مقابلہ میں آپ ﷺ کے ساتھ رہنے کو ترجیح دی؛ چنانچہ آپ ﷺ نے ان کو آزاد کر کے اپنا متبنی بنا لیا، یہ واقعہ آپ ﷺ کے نبی بنائے جانے سے پہلے کا ہے:

''وقد كان النبى ﷺ أعتق زيد بن حارثه بن شرحبيل الكلبى وتبناه قبل الوحي''(التفسیر المظہری ۷؍۲۸۴ طبع مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ)۔

رسول اللہ ﷺ کے نبی بنائے جانے کے بعد بھی حضرت زید بن حارثہؓ کا یہی تعلق آپ ﷺ کے ساتھ باقی رہا، یہاں تک کہ صحابہؓ آپ ﷺ کو ''زید بن حارثہ'' کے بجائے ''زید بن محمد'' کہا کرتے تھے؛ چنانچہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے منقول ہے:

''ما كنا نقول زيد بن الحارثه إلا زيد بن محمد ﷺ حتى نزل القرآن: ''أدعوهم لآبائهم، هو أقسط عند الله''(تفسیر مظہری ۷؍۲۸۴)۔

اسی سلسلہ میں قرآن مجید کی یہ آیت نازل ہوئی:

''وما جعل أدعاء كم أبنائكم، ذلكم قولكم بأفواهكم، والله يقول الحق وهو يهدى السبيل، أدعوهم لآبائهم، هو اقسط عند الله، فإن لم

تعلموا آبائهم فإخوانكم فی الدين ومواليكم''(احزاب:۵)۔

(اور اللہ نے تمہارے لے پالک لوگوں کو واقعی تمہارا بیٹا نہیں بنا دیا ہے، یہ تو تمہارے اپنے منہ کی باتیں ہیں، اللہ تعالی حق بات فرماتے ہیں، اور سیدھی راہ دکھاتے ہیں؛ اس لئے لے پالکوں کو ان کے حقیقی باپوں کی طرف نسبت کر کے بلاؤ، اللہ کے نزدیک پورا انصاف یہی ہے، پھر اگر تمہیں ان کے حقیقی باپوں کا علم نہ ہو تو وہ تمہارے دینی بھائی اور دوست ہیں) (تفصیل کے لئے تفسیریں دیکھی جاسکتی ہیں: تفسیر الثعالبی ۳/ ۲۱۸، طبع موسسۃ الأعلی للمطبوعات، بیروت-تفسیر البغوی ۱/ ۳۵۴، الوجیز للواحدی ۳/ ۲۱۸، التفسیر الکبیر ۱۲/ ۵۶۹ طبع دار الغد العربی، القاہری-تفسیر ابن کثیر ۳/ ۸۵، وہکذا: ص ۱۰۴-۱۰۵، طبع دار احیاء التراث العربی، بیروت-الجامع لأحکام القرآن للقرطبی ۱۴/ ۸۰ طبع الکتب العلمیہ، بیروت، لبنان-تفسیر ابی السعود ا/ ۱۰۴-۱۰۵، طبع دار احیاء التراث العربی، بیروت-احکام القرآن للجصاص ۳/ ۴۶۴، وہکذا: ص ۴۷۲ طبع الکتب العلمیہ، بیروت، الکشاف ۳/ ۵۲۸، طبع دار احیاء التراث العربی، بیروت، لبنان-التفسیر المنیر ۲۱/ ۲۳۳-۲۳۴، طبع دار الفکر، دمشق، بیروت-احکام القرآن لابن العربی ۳/ ۱۵۰۴، طبع دار احیاء التراث العربی، بیروت-تفسیر الطبری ۶/ ۱۵۸، وہکذا:۲۱ص ۱۸۰، مؤسسۃ الرسالۃ، بیروت)۔

اس سلسلہ میں دوسری نظیر حضرت سالم مولی ابو حذیفہؓ کی ہے، یہ ایرانی الاصل تھے، ''اصطخر'' ان کا آبائی مسکن تھا، حضرت ثبیتہ بنت یعار انصاریہ کے غلام ہو کر مدینہ پہنچے، انہوں نے آزاد کر دیا، تو حضرت ابو حذیفہؓ نے ان کو اپنا متبنی بنالیا(الاستیعاب فی معرفۃ الأصحاب لابن عبدالبر ۲/ ۸۰)۔

مشہور محدث حافظ ابن حجرؒ ان کے بارے میں لکھتے ہیں:

''**وكان أبو حذيفةؓ قد تبناه كما تبنى رسول الله ﷺ زيد بن حارثهؓ، فكان أبو حذيفةؓ يرى أنه ابنه فأنكحه ابنة أخيه فاطمة بنت الوليد بن عتبة، فلما أنزل الله﴿أدعوهم لآبائهم﴾رد كل أحد تبنى ابنا من أولئک إلى أبيه ومن لم يعرف أبوه رد إلى مواليه**''(الاصابۃ ۲/ ۷)۔

(ابو حذیفہؓ نے سالمؓ کو متبنی بنالیا تھا، جیسا کہ حضور ﷺ نے زید بن حارثہؓ کو متبنی بنایا تھا، اور ابوحذیفہؓ ان کو اپنا بیٹا سمجھتے تھے؛ چنانچہ انہوں نے ان سے اپنی بھتیجی فاطمہ بنت ولید بن عتبہ کا نکاح کر دیا تھا، پھر جب اللہ نے آیت "**أدعوهم لآبائهم**" نازل کی تو جس کسی نے کسی کو متبنی بنایا تھا، اس کو اس کے باپ کی طرف منسوب کر دیا گیا اور جس کے باپ کا علم نہ ہو سکا، اس کو اس کے موالی کی طرف)۔

تیسری مثال مقداد بن عمروؓ کی ملتی ہے، ان کے والد کا نام عمرو بن ثَعْلِبہ بن مالک تھا، یہ مکہ میں آ کر آباد ہو گئے تھے اور قدیم قبائلی نظام کے مطابق اسود بن عبد یغُوث زہری سے حلیفانہ تعلق قائم کر لیا تھا؛ چنانچہ اسود نے انہیں اپنا متبنی بنا لیا؛ اس لئے وہ مقداد بن اسود کہلانے لگے، جب قرآن مجید میں حکم نازل ہوا کہ متبنی کو اس کے حقیقی باپ کی طرف منسوب کیا جائے، تو لوگ انہیں مقداد بن عمروؓ کہنے لگے، اس سلسلہ میں ابن سعد کا بیان ہے:

"وكان حالف الأسود بن عبد يغوث الزهرى فى الجاهلية فتبناه، فكان يقال له المقداد بن الأسود، فلما نزل القرآن ﴿أدعوهم لآبائهم﴾قيل: المقداد بن عمرو" (الطبقات الکبری لابن سعد ۳/۱۶۱ طبع دار صادر، بیروت)۔

(انہوں نے اسود بن عبد یغوث زہری سے دور جاہلیت میں حلیفانہ معاہدہ کیا تھا تو اسود نے ان کو اپنا منہ بولا بیٹا بنا لیا؛ چنانچہ وہ مقداد بن اسود کے نام سے جانے جاتے تھے؛ لیکن قرآن کے حکم "**أدعوهم لآبائهم**" کے نازل ہونے کے بعد مقداد بن عمرو کے نام سے معروف ہوئے)۔

نیز حافظ ابن حجرؒ کا بیان ہے:

"فتبنى الأسود المقداد فصار يقال له المقداد بن الأسود وغلبت

عليه واشتهر بذلک، فلما نزلت﴿أدعوهم لآبائهم﴾قيل له: المقداد بن عمرو''(الإصابۃ ۳/ ۴۵۴)۔

(اسود نے مقداد کو متبنیٰ بنالیا، تو ان کو مقداد بن اسود کہا جانے لگا، اور اسی کے ساتھ وہ مشہور ہوگئے، پھر جب آیت کریمہ ''**ادعوهم لآبائهم**'' نازل ہوئی، تو مقداد بن عمروؓ کہے جانے لگے)۔

بلکہ حضرت مقدادؓ اس آیت کے نازل ہونے کے بعد خود کہتے تھے کہ میں مقداد بن اسود نہیں ہوں، مقداد بن عمرو ہوں، مگر مقداد بن اسود کی کچھ ایسی شہرت ہوچکی تھی کہ بہت سے لوگ ان کو مقداد بن اسود ہی کہہ دیا کرتے تھے:

''**فلما نزلت الآية، قال المقداد: أنا ابن عمرو ومع ذلک فبقي الإطلاق**''(الجامع لأحکام القرآن للقرطبی ۱۴/ ۸۰، طبع دار الکتب العلمیہ، بیروت، لبنان)۔

چوتھی مثال عامر بن ربیعہ کی ہے، ان کا خاندان حضرت عمرؓ کے والد خطاب بن نفیل کے حلیف تھے، چنانچہ خطاب نے انہیں اپنا متبنیٰ بنالیا تھا، اور انہیں عامر بن خطاب کہا جاتا تھا، جب ''**أدعوهم لآبائهم**'' والی آیت نازل ہوئی، تو پھر اپنے والد کی طرف منسوب ہوکر عامر بن ربیعہ کہلائے، مشہور مؤرخ ابن سعد کا بیان ہے:

''**وكان حليفا للخطاب بن نفيل، وكان الخطاب لما حالفه عامر بن ربيعة تبناه وادعاه إليه، فكان يقال له عامر بن الخطاب حتى نزل القرآن:﴿أدعوهم لآبائهم﴾فرجع عامر إلى نسبه، فقيل له عامر بن ربيعة**''(الطبقات الکبریٰ لابن سعد ۳/ ۳۸٦، طبع دار صادر، بیروت)۔

(ان کا خاندان خطاب بن نفیل کا حلیف تھا اور عامر بن ربیعہ نے جب خطاب

سے حلیفانہ معاہدہ کیا تو خطاب نہیں انہیں لے پالک بنالیا اور اپنی جانب ان کی نسبت کی؛ چنانچہ وہ عامر بن خطاب کے نام سے پکارے جاتے تھے؛ یہاں تک کہ قرآن کا یہ حکم آیا کہ ان کو اپنے اصلی آباء کے نام سے پکارو، تو عامر نے بھی اپنی اصل نسبت کی جانب اپنا انتساب کیا، تو پھر انہیں عامر بن ربیعہؓ کہا جانے لگا)۔

نیز حافظ ابن حجرؒ لکھتے ہیں:

''وکان الخطاب قد تبنی عامراً وکان یقال عامر بن الخطاب، حتی نزلت﴿أدعوهم لآبائهم﴾''(الاصابۃ ۲/۲۴۹)۔

(خطاب نے عامر کو متبنی بنالیا تھا، چنانچہ وہ عامر بن خطاب کہے جانے لگے، تا آں کہ آیت کریمہ ''**أدعوهم لآبائهم**'' نازل ہوگئی)۔

یہ چار مثالیں تو نام کی صراحت کے ساتھ ملتی ہیں؛ لیکن مفسرین کی صراحت سے معلوم ہوتا ہے کہ بہت سے لوگ متبنی بنایا کرتے تھے، چنانچہ بعض محققین نے لکھا ہے:

''وکثیر من العرب تبنی ولد غیره، فجاء القرآن الکریم بإبطال هذا العمل وإلغائه''(تفسیر آیات الأحکام ۴/۳۶۵، طبع: دار ابن کثیر، دمشق، بیروت، نیز دیکھئے: التفسیر المنیر: ۲۱/۲۳۵، ہکذا ۲۲/۲۴-۲۵، طبع دار الفکر، دمشق، بیروت)۔

متبنی بنانے کے اسباب

عربوں میں متبنی بنانے کا رواج کچھ اس وجہ سے نہیں تھا کہ وہ اپنی نجات کو اولاد نرینہ پر موقوف سمجھتے تھے، یا تعدد ازدواج کا رواج نہ ہونے کی وجہ سے اگر بیوی ماں بننے کی صلاحیت نہیں رکھتی تو دوسرے کو متبنی بنالیتے تھے؛ کیونکہ عربوں کے یہاں تو تعدد ازدواج کا عام رواج تھا؛ البتہ ان کے یہاں متبنی بنانے کے دو بنیادی محرکات تھے، جن کا

مفسرین نے ذکر کیا ہے:

ایک یہ کہ وہ چاہتے تھے کہ ان کا لڑکا، بہادر، صحت مند، خوبصورت اور عقل مند ہو، تو اگر ان اوصاف کا حامل کوئی غلام ہاتھ آ جاتا، تو ان کو آزاد کر کے متبنی بنا لیتے، یا جنگی قیدیوں میں ایسے لڑکے آ جاتے تو انہیں حاصل کر کے انہیں اپنا متبنی قرار دیتے، کبھی خود والدین سے بھی ان کے بچے حاصل کرتے تھے، یہ جذبہ اسلام سے پہلے عربوں میں اتنا شدید تھا کہ بعض لوگ اچھی نسل کی اولاد حاصل کرنے کے لئے اپنی بیوی کو دوسرے مردوں کے پاس بھیجنے میں عار محسوس نہیں کرتے تھے، اور جب تک وہ حاملہ نہیں ہو جاتی، اس سے الگ رہتے تھے؛ تاکہ صحت مند، خوبصورت اور ذہین اولاد حاصل ہو، چنانچہ تفسیر قرطبی میں ہے:

"كان الرجل فى الجاهلية إذا أعجبه من الرجل جلده وظفره ضمه إلى نفسه وجعل له نصيب الذكر من أولاده من ميراثه، وكان ينسب إليه فيقال فلان بن فلان" (تفسیر قرطبی ۱۴/۱۱۹)۔

(زمانہ جاہلیت میں جب کسی شخص کو کسی کی خوبصورتی، یا عقل و دانشمندی پسند آ جاتی، تو وہ اس کو اپنے سے ملا لیتا تھا، اور اس کو اس کی میراث سے نرینہ اولاد کا حصہ دیا جاتا اور وہ اسی کی طرف منسوب کیا جاتا تھا)۔

اسی سلسلہ میں مفسر قرآن سید قطبؒ کا بیان ہے:

"وكان يوجد في المجتمع أبناء لا يعرف لهم آباء، وكان الرجل يعجبه أحد هؤلاء فيتبناه ويدعوه ابنه، ويلحقه بنسبه، فيتوارث إياه توارث النسب.

وكان هناک أبناء لهم آباء معرفون، ولكن كان الرجل يعجب بأحد هؤلاء فيأخذه لنفسه ويتبناه ويلحقه بنسبه، فيعرف بين الناس بإسم الرجل الذي تبناه، ويدخل فی أسرته، وكان هذا يقع بخاصة فی السبی، حين يؤخذ الأطفال والفتيان فی الحروب والغارات، فمن شاء أن يلحق بنسبه واحدا من هؤلاء دعاه ابنه واطلق عليه إسمه وعرف به''(فی ظلال القرآن ۶/ ۴۳)۔

(اس معاشرہ میں کچھ ایسے لڑکے ملتے تھے، جن کے آباء کا علم نہ تھا اور آدمی کو جب ان میں سے کوئی اچھا لگتا، پسند آتا، تو وہ اس کو متبنی بنالیتا تھا، اور اس کو اپنے نسب میں ملا لیتا تھا، اور نسبی رشتہ سے وارث ہونے کی طرح یہ تعلق بھی ان دونوں میں احکام میراض جاری کرنے کا سبب بنتا تھا۔

اس کے برعکس کچھ ایسے لڑکے ہوتے تھے، جن کے باپ معروف تھے، مگر کوئی شخص ان میں سے ایک کو پسند کر کے اپنا بیٹا بنانے والے کے نام سے پکارا جاتا تھا، وہ اس کے خاندان میں داخل ہوجاتا تھا اور یہ معاملہ بالخصوص قیدیوں میں پیش آتا تھا، جبکہ لڑائیوں میں بچے اور جوان پکڑے جاتے تھے، تو جو آدمی ان میں سے کسی کو اپنے نسب میں ملانا چاہتا تھا، وہ اس کو لے لیتا اور اپنا بیٹا بنالیتا تھا، اور وہ اس کے نام سے منسوب ہوجاتا تھا)۔

دوسرا محرک اولاد نرینہ کا نہ ہونا تھا، جب کسی شخص کے یہاں اولاد نرینہ نہیں ہوتی، تو وہ کسی لڑکے کو اپنا متبنی بنالیتا (رحمۃ للعالمین ۲/ ۱۶۸، تالیف قاضی سلمان پوری)۔

زمانہ جاہلیت میں متبنی کے حقوق:

زمانہ جاہلیت میں متبنی کو وہ تمام حقوق حاصل تھے، جو حقیقی بیٹے کو حاصل ہوتے

ہیں، اور بیٹے سے متعلق جو ذمہ داریاں اور واجبات ہیں، وہ ذمہ داریاں بھی ان سے متعلق سمجھی جاتی تھیں، عام طور پر فقہاء نے اسے اجمالی طور پر لکھا ہے اور زیادہ تر حق میراث، متبنی لینے والے کی طرف متبنی کی نسبت اور حرمت نکاح کے معاملہ میں حقیقی بیٹے کی طرح متبنی کے اس خاندان سے تعلق کا ذکر کیا ہے، چنانچہ مفسر قرآن علامہ ابن کثیرؒ فرماتے ہیں:

"وقد كانوا يعاملونهم معاملة الأبناء من كل وجه كالخلوة بالمحارم وغير ذلك" (تفسیر ابن کثیر ۳/۶۱۰، الاحزاب)۔

(عرب متبنی کے ساتھ تمام پہلوؤں سے حقیقی اولاد کا معاملہ کیا کرتے تھے، جیسے محرم کے ساتھ تنہائی وغیرہ)۔

حضور ﷺ نے جب حضرت زید بن حارثہؓ کو متبنی بنایا تو فرمایا: تم لوگ گواہ رہو کہ وہ مجھ سے وارث ہوگا اور میں اس سے وارث ہوں گا: **"أشهدوا أنه يرثني وأرثه"** (الإصابۃ ۱/ ۶۴-۶۲)۔

سالم مولی ابی حذیفہؓ کے متبنی بنائے جانے کے سلسلہ میں امام بخاریؒ نے یہ روایت نقل کی ہے، اسی میں یہ بھی نقل کیا ہے:

"وكان من تبنى رجلا فى الجاهلية دعاه الناس إليه وورث من ميراثه" (بخاری، کتاب النکاح، حدیث نمبر: ۴۸۰۰)۔

(زمانہ جاہلیت میں جب کوئی شخص کسی کو متبنی بناتا تو لوگ اس کو اسی کی طرف منسوب کر کے پکارتے اور وہ اس کی میراث سے حصہ پاتا تھا)۔

علامہ ابن عربی مالکیؒ لکھتے ہیں:

"كان الرجل يدعو الرجل ابنا إذا رباه كأنه تبناه أى يقيمه مقام الا

بن فرد الله عليهم قولهم''(احکام القرآن ۳/ ۵۰۴، طبع دار المعرفۃ، بیروت، لبنان)۔

(ایک شخص جب کسی دوسرے کی تربیت ونگہداشت کرتا تھا، تو اسے بیٹے کے نام سے پکارتا تھا، گویا اسے اپنا متبنی بنالیتا، یعنی اس کو اپنے سگے بیٹے کے مرتبہ میں رکھتا، اللہ تعالی نے ان کے اس قول واعتقاد کی تردید فرمائی)۔

سید قطبؒ نے اپنی تفسیر میں اس سلسلہ میں لکھا ہے:

''**وصارت له حقوق البنوة وواجبا**''(فی ظلال القرآن ۶/ ۴۳)۔

(یعنی متبنی سے حقیقی بیٹوں کے حقوق اور واجبات متعلق ہوتے تھے)۔

اسلامی نقطہ نظر

اب ہمیں دیکھنا چاہئے کہ اس مسئلہ میں اسلام کا تصور کیا ہے؟ غور کیا جائے تو شریعت اسلامی میں رشتوں کا ثبوت تین طریقوں پر ہوتا ہے:

الف- تمام نسبی رشتے نکاح اور مرد وعورت کے خصوصی تعلق کے واسطہ سے وجود میں آتے ہیں، جن کو عرف عام میں ''خونی رشتے'' کہتے ہیں، ماں، باپ، دادا، دادی، نانا، نانی، چچا، پھوپھی، ماموں، خالہ، بیٹے، بیٹیاں، بھائی، بہن، یہ سارے رشتے فطری طور پر قائم ہوتے ہیں، یعنی مرد وعورت کے حلال تعلق کی بنیاد پر جب بچہ پیدا ہوتا ہے تو اسی سے دادھیالی اور نانہیالی خاندان بنتا ہے۔

ب- دوسری صورت رضاعی یعنی دودھ کے رشتوں کی ہے، اس رشتہ کی بنیاد اس بات پر ہے کہ کوئی بچہ دو سال کی عمر کے اندر کسی عورت کا دودھ پی لے، دودھ کے رشتے کا پھیلاؤ بمقابلہ خونی رشتہ کے کم ہوتا ہے، اور اس کا اثر نکاح کی حرمت تک محدود رہتا ہے، یعنی دودھ پینے والا لڑکا یا لڑکی دودھ پلانے والی عورت اس کے شوہر اور اس کے والدین

وغیرہ کے لئے محرم ہوجاتے ہیں، دودھ پینے والے کے دوسرے بھائی بہن اور ماں باپ پر اس کا اثر نہیں پڑتا، نیز اس رشتہ کا اثر صرف اس قدر رہوتا ہے کہ باہم نکاح کرنا حرام ہوجاتا ہے، مثلاً دودھ پینے والے والا لڑکا، دودھ پلانے والی عورت کی ماں، بیٹی، بہن، ساس، خالہ، پھوپھی سے نکاح نہیں کرسکتا، اسی طرح دودھ پینے والی لڑکی کا دودھ پلانے والی عورت کے شوہر سے، بیٹوں سے، والد اور بھائی اور دادا وغیرہ سے نکاح نہیں ہوسکتا (نساء: ۲۴) - رشتہ رضاعت سے نفقہ وکفالت اور دوسرے حقوق متعلق نہیں ہوتے اور نہ اس کی وجہ سے حق ولایت یا حق حضانت حاصل ہوتا ہے۔

ج- ازدواجی رشتہ ہی ایک ایسا رشتہ ہے، جو زبان کے بول یعنی ایجاب وقبول سے وجود میں آتا ہے، اس کے علاوہ کوئی اور قرابت محض زبان کے بول سے متحقق نہیں ہوتی۔

قرآن مجید میں اس بات کی صراحت موجود ہے کہ اگر کوئی شخص کسی کو ماں کہہ دے، تو اس سے ماں بیٹے کا رشتہ قائم نہیں ہوجاتا، چنانچہ اللہ تعالی کا ارشاد ہے:

''الذین یظاهرون منكم من نسائهم ما هن أمهاتهم إن أمهاتهم إلا اللائی ولدنهم وإنهم ليقولون منكرا من القول وزورا'' (سورۂ مجادلہ: ۲)۔

(تم میں سے جو لوگ اپنے بیویوں سے ظہار کرتے ہیں (یعنی بیوی کو ماں کے مشابہ قرار دیتے ہیں) وہ عورتیں ان کی ماں نہیں ہیں، ان کی مائیں تو وہ ہیں جنہوں نے ان کو جنا ہے، تو یقیناً وہ بری اور جھوٹی بات بول رہے ہیں، بے شک اللہ تعالی معاف کرنے اور درگزر کرنے والا ہے)۔

اس بات کو قرآن مجید میں ایک اور موقع پر بھی واضح کیا گیا ہے کہ جن بیویوں کو تم

ماں کہہ بیٹھتے ہو، اللہ نے ان کو تمہاری ماں نہیں بنا دیا ہے:

''**وما جعل أزواجکم اللائی تظاهرون منهن أمهاتکم**'' (احزاب:۴)۔

اسی طرح اس بات کو پوری صراحت ووضاحت کے ساتھ کہا گیا ہے کہ کسی کو بیٹا کہہ دینے سے باپ بیٹے کا رشتہ قائم نہیں ہوجاتا، اس سلسلہ میں سب سے اہم اور واضح واقعہ حضرت زید بن حارثہؓ کا ہے، جس کا ذکر اوپر آچکا ہے، اور اسی سلسلہ میں سورہ احزاب کی آیات نمبر ۵-۴ نازل ہوئی ہیں۔

ان آیات نے اس بات کو واضح کردیا ہے کہ زبان کے بول سے والدین اور اولاد کا رشتہ وجود میں نہیں آسکتا؛ اس لئے اسلام میں متبنی بنانے کی کوئی گنجائش نہیں، دادھیالی اور نانہیالی خاندان ان خونی رشتہ ہی کے ذریعہ وجود میں آتے ہیں۔

لے پالک کو حقیقی اولاد ماننے کے اثرات

کسی کو بیٹا مان لینے کا مسئلہ ایسی سیدھی سادھی بات نہیں ہے کہ جس سے صرف کفالت وپرورش متعلق ہو؛ بلکہ اس سے کئی احکام متعلق ہیں:

الف- بیٹے پر اس کے ماں باپ کا پورا پدری اور مادری سلسلہ حرام ہوتا ہے، اسی طرح ماں باپ کی اولاد بھی حرام ہوتی ہے، پھر باپ کے بھائی بہن یعنی چچا، پھوپھی اور ماں کے بھائی بہن یعنی ماموں اور خالہ بھی حرام قرار پاتے ہیں، پھر خود اولاد کا پورا اولادی سلسلہ خواہ وہ لڑکے کی طرف سے ہو، یا لڑکی کی طرف سے، ماں باپ پر حرام ہوتے ہیں، اسی طرح اس کا شوہر یا اس کی بیوی ماں اور باپ کے لئے حرام قرار پاتے ہیں:

''**حرمت علیکم أمهاتکم وبناتکم وأخواتکم وعماتکم وخالاتکم وبنات الاخ وبنات الاخت وأمهاتکم اللاتی أرضعنکم وأخواتکم من**

الرضاعة وأمهات نسائكم وربائبكم اللاتی فی حجورکم من نسائکم اللاتی دخلتم بهن فإن لم تکونوا دخلتم بهن فلا جناح علیکم وحلائل أبنائکم الذین من أصلابکم وأن تجمعوا بین الأختین"(سورۂ نساء:۲۳)۔

(تم پر تمہاری مائیں، تمہاری بیٹیاں، تمہاری بہنیں، تمہاری پھوپھیاں، تمہاری خالائیں، بھتیجیاں، بھانجیاں، تم کو دودھ پلانے والی مائیں، تمہاری رضاعی بہنیں، تمہاری بیویوں کی مائیں، تمہاری بیویوں-جن سے تم صحبت کر چکے ہو-کی لڑکیاں جو تمہارے زیر پرورش ہیں، تم پر حرام کی گئی ہیں، پھر اگر تم نے اپنی بیوی کے ساتھ صحبت نہیں کی تھی، تو ان کی بیٹیوں سے نکاح کرنے میں حرج نہیں، اور حرام ہیں تم پر تمہاری صلبی بیٹوں کی بیویاں، اور یہ بھی کہ تم دو بہنوں کو ایک نکاح میں جمع کرو)۔

گویا ایک بہت بڑا سلسلہ ہے، جو رشتۂ فرزندی کی وجہ سے ایک طرف ماں، باپ، دوسری طرف اولاد کے لئے حرام قرار پاتا ہے، متبنیٰ کو اصل اولاد اور متبنیٰ لینے والوں کو والدین کا درجہ دینے کی صورت میں یہ تمام رشتے جو ایک دوسرے کے لئے حلال تھے، حرام قرار پائیں گے۔

اسلام میں جس طرح حرام کو حلال کرنے کی اجازت نہیں ہے، اسی طرح کسی حلال چیز کو حرام بھی نہیں کیا جاسکتا، چنانچہ اس سلسلہ میں قرآن نے خود پیغمبر اسلام جناب رسول اللہ ﷺ کو بھی ایک موقع پر تنبیہ کی ہے کہ جس چیز کو اللہ تعالی نے حلال کیا ہے، آپ کیوں کر اس کو حرام کر سکتے ہیں؟

"**یا أیها النبی لم تحرم ما أحل الله لک**"(سورۂ تحریم:۱)۔

ب-متبنیٰ بنانے کا دوسرا اثر "قانون میراث" پر پڑے گا، اولاد ماں باپ کے

ترکہ میں اور والدین اولاد کے ترکہ میں لازمی طور پر وارث ہوا کرتے ہیں، میت کے والدین یا اولاد کے زندہ رہنے کی صورت میں بعض رشتہ دار میراث سے محروم ہوجاتے ہیں، بعض کے حصے کم ہوجاتے ہیں اور بعض دفعہ جن رشتہ داروں کا حصہ نہیں ملتا، انہیں والدین اور اولاد کے واسطے سے ملتا ہے، غرض کہ اولاد اور والدین کے رشتہ کا میراث کے مسئلہ پر نہایت ہی گہرا اثر پڑتا ہے، اور درجنوں صورتیں اس سے متاثر ہوتی ہیں، متبنیٰ کو اصل بیٹا ماننے کی صورت میں ان تمام احکام میراث پر اثر پڑے گا۔

ج-اس کا اثر ''احکام وصیت'' پر بھی پڑتا ہے؛ کیونکہ اپنے وارث کے لئے وصیت معتبر نہیں؛ چنانچہ رسول اللہ ﷺ حجۃ الوداع کے خطبہ میں ارشاد فرمایا:

''إن الله قد أعطى كل ذي حق حقه فلا وصية لوارث''(سنن ابوداؤد، باب الوصایا، حدیث نمبر:۲۸۷۰)۔

ایک شخص مثلاً ''الف'' کے لئے وصیت کرسکتا تھا، اور یہ وصیت ایک تہائی ترکہ تک کی ہوسکتی تھی؛ لیکن جب اس نے الف کو متبنیٰ بنالیا اور اسے اپنے بیٹے کی حیثیت حاصل ہوگئی تو وصیت کے ذریعہ اسے جو فائدہ پہنچ سکتا تھا، وہ اس سے محروم ہوگیا، اسی طرح متبنیٰ لینے والے کے حق میں خود الف کی وصیت بھی اب معتبر نہیں ہوگی۔

د-اس رشتہ کا اثر ''قانون ہبہ'' پر بھی پڑتا ہے، ہبہ کے سلسلہ میں اصول یہ ہے کہ ہبہ کرنے والا بعض شرطوں کے ساتھ ہبہ کی ہوئی چیز کو واپس لوٹا سکتا ہے، جس کو فقہ کی اصطلاح میں ''رجوع عن الہبۃ'' کہتے ہیں؛ لیکن اگر دو محرم رشتہ دار جیسے باپ، بیٹے ایک دوسرے کو ہبہ کریں تو اس صورت میں رجوع کرنے کی گنجائش نہیں ہے، چنانچہ فقہ حنفی کی مشہور کتاب ہدایہ میں ہے:

"وإن وهب هبة لذي رحم محرم منه لم يرجع فيها لقوله عليه السلام: إذا كانت الهبة لذي رحم محرم لم يرجع فيها"(الهدایہ ۳/۲۹۰ باب الرجوع فی الہبۃ)۔

(اور اگر اپنے محرم رشتہ دار کو ہبہ کر دے تو اس سے رجوع نہیں کرسکتا، اس لئے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: جب ہبہ محرم رشتہ دار کو کیا جائے تو اس سے رجوع کرنے کی گنجائش نہیں)۔

لہذا متبنی کو اگر بیٹے کا درجہ دیا جائے تو ہبہ کی قابل رجوع صورتیں نا قابل رجوع قرار پائیں گی۔

ھ-اس مسئلہ کا تعلق "قانون ولایت" سے بھی ہے، باپ کو اپنی نابالغ اور فاتر العقل اولاد پر ولایت حاصل ہوتی ہے، چنانچہ ایک ممتاز فقیہ علامہ سمر قندیؒ فرماتے ہیں:"الولاية إلى العصبات في الجملة"(تحفۃ الفقہاء ۲/۲۲۹)،(حق ولایت اصولی طور پر عصبات یعنی پدر اور پدری رشتہ داروں کو حاصل ہوگا)، وہ بعض مواقع پر اسلامی نقطہ نظر سے اپنے بچہ کا نکاح کرسکتا ہے، اس کے مال میں تصرف کرسکتا ہے، بعض حالات میں باپ کو اپنی اولاد کا نکاح کرنے پر مجبور کیا جاسکتا ہے، چنانچہ درمختار میں ہے:

"والولاية تنفيذ القول على الغير سواء شاء أو أبى"(درمختار مع ردالمحتار، کتاب النکاح ۴/۱۵۴)۔

(حق ولایت سے مراد ہے دوسرے پر اپنی رائے کو نافذ کرنا، چاہے وہ اس کو قبول کرے یا نہیں)۔

اسی طرح اگر کسی لڑکی سے باپ نے نکاح کی اجازت چاہی تو اس کی خاموشی

رضامندی کی دلیل سمجھی جاتی ہے، چنانچہ فقہ کی مشہور کتاب ہدایہ میں ہے:

''**فإذا استأذنها الولي فسكتت أو ضحكت فهو إذن**''(الہدایہ ۲/ ۳۱۴، کتاب النکاح)۔

(جب ولی کنواری لڑکی سے اجازت چاہے، اور وہ خاموش رہ جائے، یا ہنس دے، تو اسے اجازت سمجھا جائے گا)۔

ان تمام احکام میں متبنی کو اولاد ماننے کی صورت میں ایک ایسے شخص پر ذمہ داریاں عائد ہوں گی، یا ان کو وہ حقوق اور اختیارات حاصل ہوں گے، جو حقیقت میں اس کے ذمہ دار یا اہل نہیں ہیں۔

و-اس کا اثر اسلام کے'' قانون حضانت'' پر بھی پڑے گا، حضانت کے معنی حق پرورش کے ہیں، اسلام میں حق پرورش کے معاملہ میں عورت کو مرد پر ترجیح دی گئی ہے؛ اسی لئے ماں، نانی اور خالہ، باپ، دادی، اور پھوپھی پر مقدم ہے، چنانچہ ہدایہ میں ہے:

''**الأم أحق بالولد فإن لم تكن أم فأم الأم أولى من أم الأب وإن بعدت، فإن لم تكن أم الأم فأم الأب أولى من الأخوات، فإن لم تكن جدة فالأكوات أولى من العمات والخالات ثم الخالات أولى من العمات**......**وفي رواية: ''الخالة أولى من الأخت''**(ہدایہ ۲/ ۴۲۴ باب الولد من احق بہ)۔

(ماں لڑکے کی پرورش کی زیادہ حق دار ہے، ماں نہ ہوتو نانی مقدم ہے دادی سے، اگرچہ دور کی نانی ہو، اگر نانی نہ ہوتو دادی بہنوں پر مقدم ہے، اگر دادی نہ ہوتو بہنیں پھوپھیوں اور خالاؤں سے مقدم ہیں، پھر خالائیں مقدم ہیں پھوپھیوں سے......اور امام

ابوحنیفہؒ کے ایک قول کے مطابق خالہ بہن سے بھی مقدم ہے)۔

متبنی کو اصل بیٹے کا درجہ دینے میں ایک ایسی عورت کو اس کی ماں، خالہ اور بہن ہونے کی حیثیت سے حق پرورش حاصل ہوگا، جو حقیقت میں اس کے مستحق نہیں ہیں اور جس میں وہ فطری محبت پیدا نہیں ہوسکتی، جو حقیقی رشتہ داروں میں ہوتی ہے۔

ز-اس سے ایک مسئلہ ''حجاب'' کا بھی متعلق ہے، اسلامی نقطہ نظر سے عورت اپنے محرم رشتہ داروں کے سامنے چہرہ اور ہتھیلیوں کے علاوہ ہاتھ، بازو، سر، پاؤں، پنڈلی بھی کھول سکتی ہے، غیر محرم کے سامنے نہیں کھول سکتی، چنانچہ ہدایہ میں ہے:

''**وينظر الرجل من ذوات محارمه إلى الوجه والرأس والصدر والساقين والعضدين ولا ينظر إلى ظهرها وبطنها وفخذها**'' (ہدایہ ۴/۴۶۱، کتاب الکراہیہ)۔

(مرد اپنی محرم رشتہ دار خواتین کے چہرے، سر، سینہ (یعنی گلے سے متصل حصہ) پنڈلیاں اور بازو دیکھ سکتے ہیں، پیٹھ، پیٹ اور ران کو نہیں دیکھ سکتے)۔

جس شخص کو متبنی بنا دیا گیا ہے، اگر وہ لڑکا ہے، تو متبنی بنانے والی خاتون کا اس سے حجاب اختیار کرنا ضروری ہے، اسی طرح اگر وہ لڑکی ہے تو بالغ ہونے کے بعد گود لینے والے مرد سے اسے حجاب کرنا چاہئے، حقیقی اولاد ماننے کی صورت میں حجاب کا حکم اس سے متعلق نہیں ہوتا۔

ح-''نفقہ و کفالت'' کی ذمہ داری بھی بنیادی طور پر حقیقی قرابت سے متعلق ہے، باپ پر بیٹے کی کفالت واجب ہے، بعض حالات میں یہ ذمہ داری چچا، دادا، اور دوسرے ذمہ داروں سے متعلق ہوجاتی ہے، اسی طرح جب بیٹا کفالت کے لائق ہو، اور باپ اس کا

ضرورت مند ہوتو بیٹے پر ماں باپ کی کفالت واجب ہے،بعض دفعہ یہ ذمہ داری پوتے، بھتیجے اور دوسرے رشتہ داروں سے بھی متعلق ہوتی ہے،فقہاء نے اس سلسلہ میں اصولی بات لکھی ہے:

''وتجب أيضا لكل ذي رحم محرم صغير أو أثنى ولو بالغة أو بالغا عاجزا بنحوز مانة فقيرا بقدر الإرث لقوله تعالى: وعلى الوارث مثل ذلک'' (الدر المختار مع الرد ۵/۳۶۱باب النفقہ)۔

(ہر محرم نابالغ لڑکے،لڑکی گو بالغ ہوگئی ہو(مگر ابھی شادی نہ ہوئی ہو) یا ایسے بالغ لڑکے- جو اپاہج ہونے کی وجہ سے یا کسی اور وجہ سے کمانے سے عاجز ہوں اور محتاج ہوں-کا نفقہ میراث کا حقدار ہونے کے تناسب سے واجب ہوگا؛ کیونکہ اللہ تعالی کا ارشاد ہے کہ وارث پر اسی کے مثل نفقہ واجب ہے)۔

متبنی کو بیٹے کا درجہ دینے میں ہوگا یہ کہ جن پر ذمہ داری عائد ہونی چاہئے،وہ بری ہوجائیں گے،اور جن پر کفالت واجب نہیں ہے،ان پر واجب قرار پائے گی۔

اس طرح کے بعض اور جزوی مسائل بھی ہیں،جن پر اس قانون کا اثر پڑے گا؛اس لئے اس قانون سے مسلمانوں کے مذہبی قوانین میں دوررس مداخلت پیدا ہوجائے گی۔

قانون فطرت

غور کیجئے تو اس سلسلہ میں اسلامی نقطہ نظر قانون فطرت سے پوری طرح ہم آہنگ ہے:

☆ یہ ایک حقیقت ہے کہ ماں باپ اور اولاد کا رشتہ فطری اور قدرتی ہے،اولاد کے اندر ماں باپ کی جسمانی،فکری اور اخلاقی خصوصیات منتقل ہوتی ہیں،موجودہ دور کی

جنیٹک سائنس نے بھی ثابت کر دیا ہے کہ والدین اور اولاد کی شناخت ایک دوسرے سے جڑی ہوتی ہے۔

☆اسی طرح ماں باپ کے دل میں بال بچوں کی محبت، اور بال بچوں کے دل میں والدین کی محبت وعظمت قدرتی طور پر موجود ہوتی ہے، یہاں تک کہ اگر اولاد سے سخت نافرمانی کا صدور ہو تب بھی یہ قدرتی محبت دل سے نہیں نکلتی، کسی بھی دوسرے شخص کے حق میں انسان کی ایسی محبت نہیں پائی جاتی ہے؛ بلکہ واقعات اس حقیقت پر شاہد ہیں کہ بعض بچے گود لئے گئے اور بڑے ہونے کے بعد ان میں یا تو گود لینے والوں کے خلاف نفرت و بغاوت کے جذبات پیدا ہو گئے کہ انہوں نے اس بچے کی شناخت کو غصب کر لیا اور اس کی صحیح نسبت کو بگاڑ دیا ہے، یا وہ خود حقیقی والدین سے متنفر ہو گئے کہ انہوں نے ہماری پرورش کا بوجھ نہیں اٹھایا اور مجھ کو ایک دوسرے شخص کے حوالہ کر دیا، اس کے نتیجہ میں انہوں نے اپنے حقیقی والدین یا مصنوعی والدین کے خلاف بعض مجرمانہ حرکتیں بھی کی ہیں، اس کے برعکس ایسے واقعات بھی سامنے آئے ہیں اور اخبارات کی زینت بن چکے ہیں کہ ایک شخص نے کسی لڑکی کو گود لیا اور پھر اس کے ساتھ عصمت ریزی کا معاملہ کیا؛ کیونکہ حقیقی رشتہ کی وجہ سے جو محبت قائم ہوتی ہے اور والدین کے درمیان صنفی اعتبار سے جو پاکیزگی کے جذبات پروان چڑھتے ہیں، مصنوعی رشتہ میں وہ بات پیدا نہیں ہو سکتی۔

اسی طرح بعض ایسے تجزیئے بھی سامنے آئے ہیں کہ جن لوگوں کو گود لیا گیا، وہ پیشہ ور قاتل بن گئے اور سلسلہ وار قتل کا ارتکاب کرنے لگے؛ چنانچہ ۱۹۸۴ کے ایک ریسرچ رپورٹ کے مطابق اگر لے پالک بچہ کے اصل والدین اور گود لینے والوں میں سے کسی کا مجرمانہ پس منظر نہ ہو تب بھی گود لئے گئے بچوں میں سے 13,5 فیصد جرائم پیشہ بن جاتے

ہیں(Research Report:Hutchings & Gabrielli-Madvick -1984)

اس لئے حقیقت یہ ہے کہ مصنوعی اولاد یا والدین کا تصور ایسے ہی ہے جیسے انسان کے بجائے مصنوعی روبوٹ، جو کچھ کاموں میں ہاتھ تو بٹا سکتے ہیں؛ لیکن انسانی جذبات و احساسات سے عاری ہوتے ہیں، ٹھیک اسی طرح مصنوعی رشتوں کی بناء پر کسی کو باپ ماں، یا بیٹا بیٹی تو کہا جا سکتا ہے؛ لیکن والدین اور اولاد کے درمیان جو جذباتی تعلق پیدا ہوتا ہے، وہ تعلق پیدا نہیں کیا جا سکتا۔

☆ والدین اور اولاد کا رشتہ اٹوٹ ہوتا ہے، اگر یہ خود بھی اس رشتہ کو توڑ نا چاہیں تو نہیں توڑ سکتے، اور زبان کے ذریعہ جو رشتہ وجود میں آتا ہے، وہ جیسے مصنوعی طور پر وجود میں لایا جا سکتا ہے، اسی طرح مصنوعی طور پر توڑا بھی جا سکتا ہے؛ اس لئے اس میں کوئی شبہ نہیں کہ زبان کے بول سے والدین اور اولاد جیسے مقدس، اٹوٹ، محبت انگیز اور قدرتی رشتہ کو وجود میں نہیں لایا جا سکتا؛ اسی لئے قرآن مجید نے اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ وہ خدا ہی ہے جس نے اولاد کی اتھاہ محبت تمہارے دلوں میں بھر دی ہے (سورۂ طہٰ:۳۹)۔

مجبوروں کی کفالت

اس موقع سے اس بات کی وضاحت کرنا مناسب ہوگا، کہ اسلام نے کسی مجبور، نادار، یا لاوارث کی کفالت کو منع نہیں کیا ہے، ممانعت صرف اس بات کی ہے کہ اسے 'اولاد' قرار دیا جائے، اگر اس کے بغیر کوئی شخص کسی یتیم بچہ کی یا ایسے بچہ کی جس کے والدین موجود ہوں، کفالت و پرورش کی ذمہ داری قبول کرلے، تو یہ نہ صرف جائز بلکہ اکثر حالات میں مستحسن بھی ہے؛ البتہ یہ زیر کفالت لڑکے اپنے اصل والدین کی طرف منسوب ہوں گے، حق ولایت اور حق حضانت اصل والدین کو حاصل ہوگا، ان کے اور ان کے حقیقی والدین

کے درمیان میراث کے استحقاق کا تعلق ہوگا، نیز پرورش کرنے والے کے لئے گنجائش ہوگی کہ وہ اپنی جائداد میں سے کچھ اس کو ہبہ کردے، یا وفات کے بعد کے لئے وصیت کرجائے؛ کیونکہ غیر وارث کو ایک تہائی تک کی وصیت کی جاسکتی ہے، چنانچہ رسول اللہ ﷺ سے ایک صاحب نے دریافت کیا کہ کیا میں اپنے مکمل ترکہ یا نصف ترکہ کی وصیت کرسکتا ہوں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: نہیں! انہوں نے کہا: پھر کیا ایک تہائی کی وصیت کروں؟ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: زیادہ سے زیادہ ایک تہائی کی وصیت کر سکتے ہو، اور وہ بھی بہت ہے: "الثلث والثلث کثیر" (صحیح بخاری، کتاب النفقات، حدیث نمبر: ۵۳۵۴) اور جہاں تک ہبہ کی بات ہے، تو وہ کسی کو بھی کیا جاسکتا ہے۔

اگر غور کیا جائے تو بے سہارا بچوں کے مسائل کو حل کرنے میں وہ قانون زیادہ مؤثر ہے، جس کو "گارجین شپ" سے تعبیر کیا گیا ہے؛ کیونکہ اگر کسی کو گود لینے کی وجہ سے انسان کی اپنی اولاد کو نقصان پہنچتا ہو، اور اس کا حصہ تقسیم ہوجاتا ہو، تو صاحب اولاد حضرات اس سے بچنے ہی میں عافیت محسوس کریں گے، لیکن اگر اس کی حقیقی اولاد کو نقصان نہ ہوتا ہو تو ایسے لوگ بھی اس کے لئے قدم بڑھائیں گے، جو صاحب اولاد ہوں اور عام انسانی بھلائی کا جذبہ رکھتے ہوں؛ اس لئے حقیقت یہ ہے کہ اگر اس قانون کا مقصد بے سہارا بچوں کی مدد ہے تو متبنیٰ کا قانون اس میں رکاوٹ بنے گا، بلکہ اگر بے اولاد جوڑے بھی بچوں کو گود لینا چاہیں تو اس کے دوسرے رشتہ داروں کے اندر اس بچہ کے تئیں معاندانہ اور حاسدانہ جذبہ پیدا ہوسکتا ہے؛ کیونکہ ان کے حقوق میں رکاوٹ بنتا ہے۔

کیا گود لینا ایک اختیاری عمل ہے؟

عام طور پر کہا جاتا ہے کہ یہ ایک "اختیاری" قانون ہے، یہ قانون کسی کو گود لینے

پر مجبور نہیں کرتا ہے، بظاہر یہ بات درست معلوم ہوتی ہے؛ لیکن اگر گہرائی کے ساتھ غور کیا جائے تو اپنے نتائج کے اعتبار سے یہ جبری قانون کے درجہ میں آ جاتا ہے، یہ ٹھیک ہے کہ گود لینے والے شخص نے اپنے اختیار سے گود لیا؛ لیکن اگر اس کی بیوی راضی نہ ہو تو اس کے حق میں یہ عمل جبری ہو جائے گا، اسی طرح گود لینے والے کی اولاد اور دوسرے قرابت دار- جن کے حقوق اس سے متعلق ہیں- کے حق میں یہ قانون اختیاری باقی نہیں رہے گا، وہ اسے قبول کرنے پر مجبور ہوں گے۔

قانون کا مقصد

کہا گیا ہے کہ اس قانون کا مقصد بے سہارا بچوں کی مدد ہے، لیکن حقیقت میں خاص کر اندرون ملک گود لینے والے کے اندر بہت کم اس طرح کے جذبات کارفرما ہوتے ہیں، زیادہ تر گود لینے والے لوگ وہ ہوتے ہیں، جو صاحب اولاد نہیں ہوتے، وہ اس کمی کو پورا کرنے کا جذبہ رکھتے ہیں اور اس لئے جھگی جھونپڑی سے کسی غریب کا بچہ کو اٹھانے کے بجائے اپنے خاندان کے کسی بچہ یا معاشرہ میں اعلیٰ سمجھے جانے والے خاندان سے بچہ کا انتخاب کرتے ہیں، گویا بچوں کی فلاح مقصود نہیں ہوتی، خود اپنی کمی کو پورا کرنا مقصود ہوتا ہے، اگر ہندو خاندانوں میں تبنیت کے واقعات کو دیکھا جائے تو اس کی تصدیق ہوگی۔

لاوارث بچوں کی کفالت

اس بات کی وضاحت بھی مناسب ہوگی کہ اسلام کا قانون کفالت کسی بچہ کو لاوارث نہیں چھوڑتا، یہ نظام کفالت دو طرح کا ہے: انفرادی اور اجتماعی۔

الف- انفرادی نظم کفالت سے مراد یہ ہے کہ مختلف رشتہ داروں پر- تنہا یا چند افراد مل کر- نفقہ کی ذمہ داری ہے، جس شخص پر پہلے نفقہ کی ذمہداری ہے، اگر اس کی موت

ہوجائے، یا وہ اس لائق نہ رہے تو بعد والے رشتہ دار پر نفقہ کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے؛ چنانچہ نفقہ کی ذمہ داری کے اعتبار سے قرابت مندوں کی ترتیب کا فقہاء نے تفصیل سے ذکر کیا ہے کہ اگر محتاج کفالت شخص کے صرف اصول یعنی باپ دادا وغیرہ کا سلسلہ زندہ ہو تو نفقہ کس پر واجب ہوگا؟ اگر اس کے فروع یعنی اولاد اور اس کی اولاد وغیرہ کا سلسلہ ہو تو نفقہ کس پر واجب ہوگا؟ اگر اصول وفروع نہ ہوں؛ بلکہ ہم درجہ رشتہ دار (حواشی) ہوں، تو نفقہ کی ذمہ داری کس پر ہوگی؟ اگر یہ تینوں یا ان میں سے دو ہوں تو کفالت کا ذمہ دار کون ہوگا؟ (دیکھئے: البحر الرائق ۴/ ۳۴۸ باب الحضانہ)۔

ب- اجتماعی کفالت

اگر کسی لڑکے یا لڑکی کے قرابت دار نہ ہوں، یا وہ اس لائق نہ ہوں کہ ان پر اس بچہ کا نفقہ ضروری قرار دیا جاسکے، تو پھر حکومت یا مسلم سماج پر اس کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے، اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

"من ترک مالا فلورثته ومن ترک دينا أو ضيعة فإلي وأنا ولي من ولا ولي له" (مسند احمد ۴/ ۱۸۲، حدیث نمبر ۱۶۸۷)۔

(جس نے مال چھوڑا ہو تو وہ اس کے ورثہ کے لئے ہے، اور جس نے دَین یا قابل کفالت محتاج لوگ چھوڑے ہوں تو اس کی ذمہ داری مجھ پر ہے، اور جس کا کوئی ولی نہ ہو، میں اس کا ولی ہوں)۔

آپ ﷺ کی حیثیت جیسے ایک داعی حق اور ہادی کی تھی، ویسے ہی امیر وفرماں روا کی بھی تھی، اور اسی حیثیت سے آپ ﷺ نے یہ بات ارشاد فرمائی؛ اس لئے حکومت ایسے لوگوں کی ذمہ دار ہے، اور جو ذمہ داریاں قانونی طور پر حکومت سے متعلق ہوتی ہیں، وہ

اخلاقی طور پر سماج کی بھی ذمہ داری ہوتی ہے۔

چنانچہ اس پس منظر میں ہندوستان میں مسلم سماج نے اس کے لئے دو طرح کا انتظام کیا ہے: ایک تو ملک کے اکثر بڑے اور متوسط شہروں میں ''دار الیتامی'' قائم ہیں، جن میں یتیم و نادار بچوں اور بچیوں کے لئے قیام و طعام، تعلیم و تربیت اور شادی کا نظم ہوتا ہے، دوسرے لڑکوں اور لڑکیوں کے دینی مدارس میں ان بچوں اور بچیوں کے لئے مفت قیام و طعام، تعلیٰ، علاج اور دوسری ضروریات کا نظم کیا جاتا ہے، چنانچہ اس وقت ہزاروں بلکہ لاکھوں یتیم اور نادار لڑکوں اور لڑکیوں کی رہائش وغیرہ کا یہ ادارے نظم کر رہے ہیں، اور بہتر طریقہ پر ان کی عزت نفس کا خیال کرتے ہوئے ان کی خدمت کی جارہی ہے، جو لوگوں بچوں کی فلاح کا جذبہ رکھتے ہیں، وہ ان اداروں میں بچوں کے لئے اسپانسر شپ قبول کرتے ہیں، اور عمومی تعاون بھی کرتے ہیں؛ اس لئے مسلمان سماج کے لئے یہ کوئی گمبھیر مسئلہ نہیں ہے۔

☆☆☆

یتیم پوتے کی میراث

اس وقت پوری دنیا میں سرمایہ دارانہ نظام سکہ رائج الوقت کی طرح جاری وساری ہے، جس میں دولت کو زیادہ مرتکز رکھنے کی کوشش کی جاتی ہے، اسلام بنیادی طور پر تقسیم دولت کا قائل ہے اور چاہتا ہے کہ مال واسباب چند ہاتھوں میں سمٹ کر نہ رہ جائیں؛ چنانچہ اللہ تعالی نے مال غنیمت کی تقسیم کے نظام پر روشنی ڈالتے ہوئے فرمایا:

''کی لا یکون دولة بین الأغنیاء منکم'' (سورۂ حشر:۷)

(......تاکہ (دولت) تم میں سے مالدار ہی کے درمیان گھر کر نہ رہ جائے)۔

اسلام کے دوسرے مالی احکام کی طرح میراث میں بھی اس کا خیال رکھا گیا ہے، بعض مذاہب میں صرف بڑا بیٹا پورے ترکہ کا حق دار ہوتا تھا، اور بعض میں بیٹوں کو حق دیا جاتا تھا، بیٹیاں محروم رہتی تھیں، شریعت اسلامی نے تقسیم میراث کا ایک جامع نظام مقرر فرمایا، جس میں ترکہ کی زیادہ سے زیادہ تقسیم ہو اور بیش از بیش لوگ اس سے استفادہ کرسکیں، اس سلسلے میں میراث کے مستحق ہونے کے لئے بنیادی اصول کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا:

''للرجال نصیب مما ترک الوالدان والأقربون وللنساء نصیب مما ترک الوالدان والأقربون مما قل منه أو کثر نصیبا مفروضا'' (سورۂ نساء:۷)۔

(والدین اور نزدیک ترین رشتہ دار جو چیزیں چھوڑ جائیں، اس میں مردوں کے لئے بھی حصہ ہے، اور عورتوں کے لئے بھی، والدین اور نزدیک ترین رشتہ داروں کی چھوڑی ہوئی چیزوں میں حصہ ہے، خواہ وہ چیز کم ہو یا زیادہ، اور یہ حصہ لازمی طور پر ہے)۔

اس آیت سے تین اصول معلوم ہوئے:

اول یہ کہ انسان جب تک زندہ رہے، اس وقت تک مستقبل کے امکانی ورثہ کو اس کے مال میں حق وراثت حاصل نہیں، ایسا نہیں ہے کہ باپ کی زندگی میں اس کے بیٹے یا بیٹی کا حق باپ کی دولت سے متعلق ہوجائے؛ لہذا حق میراث سے ان ہی لوگوں کا حق متعلق ہوگا، جو مورث کے مرنے کے وقت موجود ہوں، جو لوگ اس سے پہلے دنیا سے جا چکے، اس کے ترکہ میں ان کا کوئی حق نہیں رہا، مثلاً اگر ایک شخص کے تین بیٹے اور دو بیٹیاں ہیں، اور اتفاق سے ایک بیٹے اور ایک بیٹی کا انتقال اس کی زندگی میں ہوگیا تو اس اصول کے تحت اس شخص کے ترکہ میں اس کا کوئی حق ثابت نہیں ہوگا- ''مما ترک'' کے لفظ سے یہ اصول واضح ہوتا ہے۔

دوسرا اصول یہ ہے کہ ترکہ کی تقسیم ضرورت و حاجت کے اعتبار سے نہیں؛ بلکہ رشتہ وقرابت کے اعتبار سے ہے، مثلاً: ایک شخص کی اولاد میں بعض بہت غریب ہیں، اور بعض مالدار، تو ایسا نہیں ہوسکتا کہ غریبوں کو تو ترکہ دیا جائے یا زیادہ دے دیا جائے، اور مالداروں کو محروم کردیا جائے یا کم دیا جائے؛ اس لئے ترکہ کی تقسیم میں قرابت کا لحاظ رکھا جائے گا نہ کہ دولت وغربت کا۔

تیسرا اصول قرابت داروں میں ترجیح کا معلوم ہوا، یعنی انسان کی قرابت مندی کا دائرہ تو بہت وسیع ہے، اگر آدمی چند پشت اوپر چلا جائے تو قرابت داروں کا ایک پورا محلّہ

شامل ہوجائے گا؛لہذا اگر ہر قرابت دار کو ترکہ میں حصہ دار بنایا جائے تو ترکہ کی تقسیم اس طرح ہوگی کہ کسی کی کوئی ضرورت پوری ہی نہ ہو سکے گی،بعض اوقات ایک مکان اور ایک کمرہ سیکڑوں لوگوں میں تقسیم کرنا ہوگا، اور اردو محاورہ کے مطابق ''جوتیوں میں دال بٹے گی'' ظاہر ہے کہ یہ بات کسی بھی طرح مناسب نہ ہوتی اور اس کی وجہ سے غیر معمولی اختلاف وانتشار بھی پیدا ہوجاتا؛اس لئے قرآن مجید نے یہ ترجیح متعین کی کہ قریب ترین رشتہ دار ترکہ کے حق دار ہوں گے، اور نسبتاً قریبی رشتہ دار کی موجودگی میں دور کا رشتہ دار ترکہ سے محروم ہوجائے گا۔

اسی اصول پر والد کی موجودگی میں دادا اور دادی کو حق میراث حاصل نہیں ہوگا، ماں موجود ہوتو نانا اور نانی کا ترکہ میں کوئی حصہ نہیں ہوگا، بیٹے موجود ہوں تو پوتوں اور پوتیوں کا حصہ نہیں ہوگا،خواہ ان کے والد زندہ ہوں یا گزر چکے ہوں، بیٹیاں موجود ہوں تو نواسوں اور نواسیوں کا حصہ نہیں ہوگا،خواہ ان کی والدہ زندہ ہوں یا گزر چکی ہوں۔

مگر بعض حضرات کا خیال ہے کہ اگر کسی شخص کے کئی بیٹے تھے،ان میں سے ایک بیٹے کا انتقال ہوگیا،اور اس کی یتیم اولاد موجود ہے تو دادا کے ترکہ میں اس کا حق ہونا چاہئے، مگر یہ درست نہیں؛ کیونکہ

یتیم پوتے کا حق میراث اور قرآن مجید

الف- دادا،دادی کے ترکہ میں سے پوتے، پوتیوں کو اپنے باپ کے واسطے سے حق میراث حاصل ہوتا ہے، یہاں صورت حال یہ ہے کہ ان کے مرحوم باپ اور ماں کا والدین کے ترکہ میں حق ثابت ہی نہیں ہوسکا تھا؛ کیونکہ یہ حق اسی وقت ثابت ہوتا، جب وہ ان کے انتقال کے وقت زندہ رہے ہوتے۔

ب- ہوسکتا ہے کہ یہ یتیم پوتے، پوتیاں، محتاج اور ضرورت مند ہوں؛ لیکن محتاجی ترکہ کے حق دار ہونے کی بنیاد نہیں ہے؛ بلکہ اس کی بنیاد قرابت ہے۔

ج- جب ان یتیم بچوں کے چچا اور پھوپھی زندہ ہیں تو مرنے والے سے ان کی قرابت بڑھی ہوئی ہے؛ اس لئے اسی اصول کے تحت نسبتاً قریب کے رشتہ دار دور کے رشتہ دار کے لئے حاجب بن جائیں گے، دادا، دادی کے ترکہ میں ان کا حق باقی نہیں رہے گا۔

غرض کہ بیٹے کی موجودگی میں یتیم پوتے کا مستحق میراث نہ ہونا علماء کی خود ساختہ بات نہیں ہے؛ بلکہ یہ قرآن کے مقرر کئے ہوئے اصولوں پر مبنی ہے۔

حدیث نبوی ﷺ

قرآن مجید میں جن لوگوں کے حصے مقرر کر دیئے گئے ہیں، ان کو ''ذوی الفروض'' یا ''اصحاب الفرائض'' کہا جاتا ہے، ان میں اولاد شامل نہیں ہیں، اولاد کے حصہ کے لئے کوئی خاص مقدار متعین نہیں ہے؛ بلکہ اگر دوسرے ذوی الفروض نہ ہوں تو پورا ترکہ، اور ہوں تو ان کو دینے کے بعد بقیہ ترکہ اس طرح تقسیم ہوگا کہ بیٹوں کو دو دو حصے اور بیٹیوں کو ایک ایک حصہ ملے گا، اسی پس منظر میں رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

''**الحقوا الفرائض بأهلها، فما بقى فلأولى رجل ذكر**''(بخاری: عن عبداللہ بن عباس، کتاب الفرائض، حدیث نمبر: ۶۷۳۵)۔

(میراث کے حصے ان کے مقررہ حصہ داروں کو دو، پھر جو بچ رہے، وہ قریب ترین مرد رشتہ داروں کا حق ہوگا)۔

اس حدیث نے بھی اسی اصول کو واضح کیا کہ ذوی الفروض کو حصہ دینے کے بعد جو بچ جائیں وہ قریب ترین مرد رشتہ دار کو ملے گا، اور ظاہر ہے کہ جب بیٹے ہوں اور پوتے

بھی ہوں تو بیٹا قریب ترین رشتہ دار ہے؛ اس لئے وہی ترکہ کا مستحق ہوگا، پوتے نہ قریبی رشتہ دار ہیں اور نہ ذوی الفروض میں شامل ہیں۔

آثار صحابہ

صحابہ میں علم فرائض کے اعتبار سے سب سے اونچا درجہ حضرت زید بن ثابتؓ کا تھا، خود رسول اللہ ﷺ نے ان کے بارے میں فرمایا کہ وہ میرے رفقاء میں سب سے زیادہ فرائض کے احکام سے واقف ہیں: ''**وأعلمها بالفرائض زید**'' (سنن ترمذی، حدیث نمبر: ۳۷۹۰)۔ حضرت زید بن ثابتؓ کا جو فتوی امام بخاریؒ نے نقل کیا ہے، وہ یہ ہے:

''**وقال زید بن ثابت: ولد الأبناء بمنزلة الولد اذا لم یکن دونهم ولد ذکر، ذکرهم کذکرهم وأنثاهم کأنثاهم یرثون کما یرثون، ویحجبون کما یحجبون، ولا یرث ولد الابن مع الابن**'' (بخاری، کتاب الفرائض، باب: ۷)

(میت کے پوتے بیٹے کے درجہ میں ہیں؛ بہ شرطیکہ ان کے مقابلہ میں کوئی بیٹا موجود نہ ہو، پوتے بیٹوں کی طرح ہیں اور پوتیاں بیٹیوں کی طرح، جیسے بیٹے وارث ہوتے ہیں اسی طرح پوتے (بیٹیوں کے نہ ہونے کی صورت میں) وارث ہوتے ہیں، اور جیسے بیٹے (اپنے سے دور کے رشتہ داروں کے لئے) حاجب بنتے ہیں؛ اسی طرح پوتے (اپنے بعد کے رشتہ داروں کے لئے) حاجب بنتے ہیں، اور بیٹا موجود ہو تو پوتا وارث نہیں ہوسکتا)۔

اجماع امت

اس بات پر عہد صحابہ سے علماء امت کا اجماع واتفاق ہے کہ اگر مرنے والے کے

بیٹے زندہ ہوں تو پوتے میراث کے حق دار نہیں ہوں گے؛ چنانچہ علامہ ابن حزم ظاہری لکھتے ہیں:

"ولا يرث بنو الابن مع الابن الذكر شيئا أباهم كان أو عمهم......وهذا نص كلام النبي ﷺ ......واجماع متقن" (المحلی ۹/۲۷۱ مسألۃ ۱۷۲۶، موسوعۃ الاجماع ۳/ ۱۱۲۴)۔

(بیٹے کی موجودگی میں پوتا میراث کا مستحق نہیں ہوگا، چاہے اس کا باپ زندہ ہو یا اس کا چچا، یہ رسول اللہ ﷺ کی صراحت سے بھی ثابت ہے، اور اس پر یقینی اجماع بھی ہے)۔

غرض کہ قرآن وحدیث، آثار صحابہ اور اجماع امت سے یہ بات ثابت ہے کہ بیٹوں کی موجودگی میں یتیم پوتے میراث کے حقدار نہیں ہوں گے۔

عقل وقیاس

یہی عقل وقیاس کا تقاضا بھی ہے؛ کیونکہ اگر اس معاملہ میں یتیم پوتوں کے والد کو زندہ تصور کر کے ان کے حصے لگائے جائیں، اور پھر ان کو ان کی اولاد پر تقسیم کیا جائے تو کوئی وجہ نہیں کہ دوسرے مواقع پر اس اصول کو نہیں برتا جائے، مثلاً باپ کی موجودگی میں دادا، دادی اور ماں کی موجودگی میں نانا نانی کو حصہ نہیں ملتا؛ حالانکہ وہ بڑھاپے اور اکثر اوقات کسب معاش کی طاقت سے محروم ہونے کے اعتبار سے کچھ کم قابل رحم اور لائق ترس نہیں ہوتے؛ اسی طرح بیٹا موجود ہو تو میت کے بھائی بہن حق میراث سے محروم ہو جاتے ہیں؛ حالانکہ بعض حالات میں وہ اس کے بہت زیادہ ضرورت مند ہو سکتے ہیں، ظاہر ہے کہ ان اقارب کو ترکہ میں حصہ نہیں ملتا، پس عقل ومصلحت کا تقاضا یہی ہے کہ جیسے دوسرے

معاملات میں قریب ترین رشتہ دار دور کے رشتہ دار کو محروم کر دیتا ہے، براہ راست اولاد کی موجودگی میں بالواسطہ اولاد محروم ہو جائے۔

بعض شبہات

یتیم پوتوں، پوتیوں کے میراث کے سلسلے میں نہ کوئی شرعی دلیل ہے اور نہ کوئی عقلی دلیل؛ بلکہ عام طور پر ایک جذباتی بات کہی جاتی ہے کہ یہ بے چارے یتیم اور غریب ومحتاج ہیں، اگر دادا کے ترکہ میں سے ان کو حصہ نہیں ملے تو کیسے ان کی ضرورت پوری ہوگی اور کیوں کر ان کی پرورش ہو سکے گی؟ مگر یہ بات کئی پہلوؤں سے قابل غور ہے:

الف-یتیم پوتوں اور پوتیوں کا اپنے چچاؤں کے مقابلے غریب ومحتاج ہونا ضروری نہیں، بہت سی دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ بیٹے انتقال کے بعد بیٹے کی اولاد کی طرف دادا کا جھکاؤ بڑھ جاتا ہے، وہ تعلیم وتربیت کے اعتبار سے ایک مقام حاصل کر لیتے ہیں، اور پھر ان کی حالت اپنے چچاؤں سے کئی درجہ بہتر ہوتی ہے؛ اس لئے لازماً ان کو محتاج سمجھنا اور ان کے مقابلہ ان کے چچاؤں کو معاشی اعتبار سے بہتر تصور کرنا درست نہیں؛ بلکہ دونوں پہلوؤں کا یکساں امکان ہے۔

ب-جن لڑکوں اور لڑکیوں کے والد کا انتقال ہو گیا، ان کو تو دادا کی جائداد سے حصہ مل جائے گا، اور جن کے والد زندہ ہیں، ان کی اولاد کو حصہ نہ مل پائے، یہ کوئی انصاف کی بات نہیں ہے؛ کیونکہ ممکن ہے کہ دادا کے ترکہ سے ان کے والد کو جو حصہ ملے، وہ والد کے ہاتھوں ہی خرچ ہو جائے، اور ان کی وفات کے بعد ان کی اولاد کے لئے اس میں سے کچھ باقی نہ رہے۔

ج-یہ بات بھی انصاف کے خلاف ہے کہ یتیم پوتوں، پوتیوں یا نواسوں،

نواسیوں کے سلسلے میں تو عاریت پر مبنی اصول کو برتا جائے اور بوڑھے دادا، دادی اور نانا، نانی کے ساتھ اس اصول کو اختیار نہیں کیا جائے۔

د-سوال یہ ہے کہ ترکہ حاجت کی بنیاد پر ہے یا قرابت کی بنیاد پر؟ اگر قرابت کی بنیاد پر ہے تو پھر خاص اس مسئلہ میں حاجت کو کس طور پر معیار بنایا جا سکتا ہے؟

ھ-ترکہ کا مقصد پرورش نہیں ہے، اگر اس کا مقصد پرورش ہو تو جن لوگوں کے مورث ترکہ چھوڑ کر نہیں جائیں، ان کی پرورش کس طرح ہوگی؟

حقیقت یہ ہے کہ یتیم پوتے کی میراث کے مسئلہ کو جس انداز پر پیش کیا جاتا ہے، وہ واقعہ کے بھی خلاف ہے، اور شریعت میں تقسیم میراث کے جو اصول مقرر ہیں، ان کے بھی مغائر ہے۔

مسئلہ کا حل

لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ اگر دادا یا نانا ایسے محروم ہوجانے والے پوتوں، پوتیوں کے ساتھ حسن سلوک کرنا چاہیں تو ان کے لئے راستے بند ہیں؛ بلکہ ان کے لئے دو صورتیں ہیں:

الف-ہبہ: یعنی ان کو زندگی ہی میں جائداد کے کچھ حصہ کا مالک بنادیا جائے، اس میں مقدار کی کوئی قید نہیں ہے، یہ بھی ممکن ہے کہ اس کے والد کے زندہ ہونے کی صورت میں اس کا جتنا حصہ ہوسکتا تھا، اس سے زیادہ حصہ دادا اپنے پوتے کو دے دے، یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ اگر کوئی شخص اپنے محرم رشتہ دار کو کوئی چیز ہبہ کرے تو یہ ہبہ ناقابل واپسی ہوتا ہے، اس لئے اگر دادا نے پوتے کو کوئی چیز ہبہ کردی تو اب وہ اس سے رجوع بھی نہیں کرسکتا۔

ب- وصیت: یعنی وہ وصیت کرسکتا ہے کہ اس کی موت کے بعد اس کے ترکہ میں سے اتنی مقدار اس کے محروم الارث پوتے پوتی کو دے دیا جائے، وہ ایک تہائی ترکہ کی بھی وصیت کرسکتا ہے، وارث کے حق میں تو وصیت معتبر نہیں ہے؛ لیکن چونکہ پوتا وارث نہیں؛ اس لئے اس کے حق میں وصیت کا اعتبار ہے، مثلاً اگر دادا پوتے کے لئے ایک تہائی کی وصیت کر جائے تو ممکن ہے کہ یہ اس کے چچا کے فی کس حصہ سے بھی بڑھ جائے۔

ج- ہبہ اور وصیت کی صورت تو اختیار ہے؛ لیکن نفقہ کا حکم لازمی ہے، اور اگر کسی شخص کے والد نہ ہوں تو دادا پر اس کا نفقہ واجب ہوتا ہے، اور دادا نہ ہوں تو پھر دوسرے رشتہ داروں پر واجب ہے، جیسے میراث کے حق دار ہونے میں رشتہ داری کا لحاظ رکھا جائے گا، اسی طرح نفقہ کے واجب ہونے میں بھی رشتہ داری ملحوظ ہوگی، فقہاء نے تفصیل سے اس پر روشنی ڈالی ہے؛ چنانچہ فقہ حنفی کی مشہور کتاب فتاوی عالمگیری میں ہے:

'' نفقہ ہر محرم رشتہ دار کا واجب ہے، اگر وہ نابالغ اور محتاج ہو، اور عورت ہو تو بالغ کا بھی؛ بشرطیکہ محتاج ہو، یا بالغ محتاج مرد ہو، مگر اپاہج یا نابینا ہو، تب بھی اس کا نفقہ واجب ہوگا، اور یہ نفقہ میراث کے تناسب سے واجب ہوگا، اور جس پر واجب ہے، اسے نفقہ ادا کرنے پر مجبور بھی کیا جائے گا، نیز اعتبار صرف اس بات کا ہے کہ وہ اس سے میراث پانے کا اہل ہو، حقیقتاً میراث کا مستحق ہو، یہ ضروری نہیں، اور صرف ذوی الارحام اگر مالدار ہوں، تو ان کا نفقہ واجب نہیں ہوگا، اسی طرح ان عمر رسیدہ لوگوں کا بھی جو صحت مند ہوں، چاہے وہ محتاج ہوں، دوسروں پر ان کا نفقہ واجب نہیں کیا جائے گا، ہاں ذوی الأرحام میں سے عمر رسیدہ خواتین کا نفقہ واجب ہوگا، اگر وہ تندرس ہوں؛ بشرطیکہ ان کو نفقہ کی ضرورت ہو'' (فتاوی عالمگیری ۱/ ۵۶۰-۵۶۶)۔

اسی طرح علامہ ابن عابدین شامی اقارب کے نفقہ کی ترتیب پر گفتگو کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''جب باپ کے پاس مال نہ ہو، اور دادا یا ماں یا ماموں یا چچا خوش حال ہوں تو انہیں نابالغ بچہ کے نفقہ پر مجبور کیا جائے گا، اور جب باپ خوش حال ہوجائے تو وہ اس پر اپنے کئے ہوئے اخراجات کے لئے رجوع کریں گے، اسی طرح قریبی رشتہ دار موجود نہ ہوں، تو دور کے رشتہ دار کو نفقہ دینے پر مجبور کیا جائے گا، اگر ماں خوش حال ہو، تو ماں پر نفقہ ہوگا، اور وہ بعد میں اس کے باپ سے پیسہ وصول کرے گی، اسی طرح اگر باپ نہ ہو، تو مذکورہ رشتہ داروں کو نفقہ پر مجبور کیا جائے گا'' (ردالمختار ۵/۳۳۸ باب النفقہ)۔

اس لئے اگر کوئی لڑکا یا لڑکی یتیم ہوجائے تو شریعت کے مقرر کئے ہوئے اصول کے مطابق اس کا نفقہ اس کے رشتہ دار ادا کریں گے، بہر حال شرعاً جن لوگوں سے نفقہ کا حکم متعلق ہے، ان پر یہ حکم وجوبی ہے، محض استحباب اور جواز کے درجہ میں نہیں ہے؛ کیونکہ قرآن مجید میں اقرباء پر نفقہ واجب قرار دیتے ہوئے فرمایا گیا ہے:

''**وعلی الوارث مثل ذلک**'' (سورۂ بقرہ: ۲۳۳)۔

علی کا لفظ عربی زبان میں کسی چیز کے واجب و لازم ہونے کو واضح کرتا ہے:

''**واما علیٰ فھو للالزام باعتبار اصل الوضع**'' (اصول السرخسی ۱/۲۲۱)۔

☆☆☆

حق میراث اور خواتین

اسلام سے پہلے دنیا کے اکثر مذاہب میں خواتین کا میراث میں کوئی حق نہیں سمجھا جاتا تھا، عربوں کا خیال تھا کہ جو لوگ قبیلہ کی مدافعت کر سکتے ہوں اور لڑنے کی صلاحیت رکھتے ہوں، وہی میراث پانے کے حقدار ہیں، یہودیوں میں سارا ترکہ پہلوٹھے کا حق مانا جاتا تھا، ہندوؤں کے یہاں بھی عورت کا میراث میں کوئی حصہ نہیں ہوتا تھا، یہاں تک کہ انیسویں صدی تک یورپ میں عورتوں کو میراث میں کوئی حصہ نہیں ملتا تھا، اسلام نے جہاں مرد رشتہ داروں کو حصہ دار بنایا، وہیں ان کی ہم درجہ خواتین کو بھی میراث کا مستحق قرار دیا، والد کی طرح والدہ کو، بیٹے کی طرح بیٹی کو، بھائی کی طرح بہن کو، شوہر کی طرح بیوی کو وغیرہ، آج پوری دنیا میں خواتین کو جو ترکہ کا مستحق مانا جاتا ہے، وہ دراصل شریعت اسلامی کا عطیہ ہے۔

ذوی الفروض اور خواتین

اسلام کے قانون میراث میں جن رشتہ داروں کو مقدم رکھا گیا ہے، اور جو کسی حال میں ترکہ سے محروم نہیں ہو سکتے، وہ چھ ہیں، جن میں تین مرد ہیں: باپ، بیٹا اور شوہر، تین عورتیں ہیں: ماں، بیٹی اور بیوی، اس کے علاوہ خصوصی اہمیت ان حقداروں کو حاصل ہے، جن کو 'ذوی الفروض' کہا جاتا ہے، یعنی وہ اعزہ جن کے حصے مقرر کر دیئے گئے ہیں، ان میں مردوں سے زیادہ تعداد خاتون رشتہ داروں کی ہے، اس لئے مرد چھ حالتوں میں

ذوی الفروض میں شمار کیا جاتا ہے، اور عورت ۱۷ حالتوں میں، اس حیثیت سے میراث کی مستحق ہوتی ہے؛ چنانچہ یہاں حصوں کا تناسب اور ان کی مستحق خواتین کا ذکر کیا جاتا ہے:

الف-دو تہائی:

۱-دو یا دو سے زیادہ بیٹیاں ۲-دو یا دو سے زیادہ پوتیاں

۳-دو یا دو سے زیادہ سگی بہن ۴-دو یا دو سے زیادہ باپ شریک بہن

ب-نصف:

۱-ایک بیٹی ۲-ایک پوتی

۳-ایک سگی بہن ۴-ایک باپ شریک بہن

ج-ایک تہائی:

۱-ماں ۲-ماں شریک بہن

د-چھٹا حصہ:

۱-ماں ۲-دادی

۳-پوتی ۴-باپ شریک بہن

۵-ماں شریک بہن

ھ-چوتھائی:

۱-بیوی

و-آٹھواں حصہ:

۱-بیوی

اس میں یہ بات قابل توجہ ہے کہ متعینہ حصوں میں سب سے زیادہ دو تہائی اور

اس کے بعد نصف ہے، دو تہائی حصہ کا مردوں میں سے کوئی مستحق نہیں ہوتا اور نصف کا مستحق بھی مردون میں صرف شوہر ہوسکتا ہے، جب کہ میت کی اولاد نہ رہی ہو۔

مقدار کے اعتبار سے خواتین کے حصہ پانے کی چار حالتیں ہوتی ہیں:

۱- جب عورت کا حصہ اپنے ہم درجہ رشتہ دار مرد کے مقابلہ آدھا ہوتا ہے۔

۲- جب مرد اور عورت کا حصہ برابر ہوتا ہے۔

۳- جب عورت کا حصہ مرد سے زیادہ ہوتا ہے۔

۴- جب عورت وارث ہوتی ہے اور مرد وارث نہیں ہوتا ہے۔

یہاں ان تمام صورتوں کا احاطہ مقصود نہیں ہے؛ لیکن اجمالی طور پر ان کا ذکر کیا جاتا ہے:

عورت کا حصہ مرد کے مقابلہ نصف

اپنے ہم درجہ مرد رشتہ دار کے مقابلہ عورت کے نصف حصہ پانے کی صورتیں یہ ہیں:

۱- بیٹے کے ساتھ بیٹی: مثلاً کسی نے ایک بیٹا اور ایک بیٹی کو چھوڑا اور اس کا ترکہ تین لاکھ روپئے ہو تو ایک لاکھ بیٹی کا حق ہوگا اور دو لاکھ بیٹے کا۔

۲- باپ کے ساتھ ماں: بشرطیکہ اولاد اور شوہر یا بیوی نہ ہو، اس صورت میں ماں کو ایک تہائی ملے گا اور عصبہ ہونے کی بناء پر باپ کو دو تہائی مل جائے گا۔

۳- حقیقی بہن یا باپ شریک بہن: حقیقی بھائی یا باپ شریک بھائی کے ساتھ وارث ہو، یعنی میت نے والدین یا اولاد، شوہر یا بیوی کو نہ چھوڑا ہو، صرف اس کے حقیقی بھائی اور حقیقی بہن یا باپ شریک بھائی یا باپ شریک بہن اس کے وارث ہوں، اس وقت

بہن کے مقابلہ بھائی کا حصہ دوگنا ہوگا، مثلاً ایک حقیقی بھائی اور ایک حقیقی بہن ہو، تو بھائی کو دوتہائی ملے گا اور بہن کو ایک تہائی۔

۴- شوہر کا حصہ بمقابلہ بیوی کا دوہرا ہوگا، یعنی اگر بیوی کا انتقال ہوا اور اس نے کوئی اولاد نہیں چھوڑی، تو شوہر کو اس کے ترکہ کا نصف مل جائے گا اور اولاد بھی چھوڑی ہو تو چوتھائی ملے گا، اس کے برخلاف شوہر کے ترکہ میں سے بیوی کو اولاد نہ ہونے کی صورت میں چوتھائی اور اولاد ہونے کی صورت میں آٹھواں حصہ ملے گا۔

مردوں کے برابر حصہ

جن حالات میں عورتوں کا حصہ مردوں کے برابر ہوتا ہے، ان میں سے چند یہ ہیں:

۱- میت نے ماں، باپ اور بیٹے کو چھوڑا ہو، تو ماں اور باپ دونوں کو چھٹا حصہ ملے گا، اسی طرح اگر اس نے ماں، باپ اور دو بیٹیوں کو چھوڑا، تب بھی ماں اور باپ دونوں کو چھٹا حصہ ملے گا اور دوتہائی بیٹیوں کو ملے گا، نیز اگر کسی عورت نے شوہر، باپ، ماں اور ایک بیٹی کو چھوڑا ہو تو اس صورت میں بھی ماں اور باپ چھٹے حصہ کے مستحق ہوں گے۔

۲- ماں شریک بھائی بہن کا حصہ بھی برابر ہوگا، جیسے ایک عورت نے شوہر کو، ماں کو اور ماں شریک بھائی کو چھوڑا، تو ماں شریک بھائی چھٹے حصہ کا مستحق ہوگا، اگر شوہر اور ماں کے علاوہ صرف اخیافی بہن کو چھوڑا تو وہ بھی چھٹے حصے کی ہی مستحق ہوگی، اسی طرح اگر کسی عورت کا انتقال ہوا، اس کے ورثہ، شوہر، ماں، اخیافی بھائی اور اخیافی بہن ہوں، تو نصف شوہر کا حصہ ہوگا، چھٹا حصہ ماں کا اور ایک تہائی میں بھائی اور بہن کا حصہ برابر ہوگا۔

۳- بہت سی حالتیں ایسی ہیں کہ اگر مرنے والے کا ایک ہی وارث ہو، خواہ مرد ہو

یا عورت، وہ پورے ترکہ کا حقدار قرار پاتا ہے، جیسے: باپ، بیٹا، بھائی، شوہر، ماموں اور چچا، اسی طرح خاتون رشتہ داروں میں: ماں، بیٹی، بہن، بیوی، خالہ اور پھوپھی، مثلاً اگر کسی شخص کے انتقال پر صرف اس کا بیٹا ہی باقی بچا ہوتو وہ پورے ترکہ کا حقدار ہوگا؛ اس لئے کہ وہ عصبہ ہے، اسی طرح اگر اس نے صرف بیٹی کو چھوڑا ہوتو وہ پورے ترکہ کی حقدار ہوگی، نصف تو اس کا متعینہ حصہ ہوگا اور باقی نصف اس کو بطور ''رد'' کے ملے گا۔

۴-بعض دفعہ حقیقی بہن اور حقیقی بھائی کا حصہ بھی برابر ہوجاتا ہے، جیسے ایک عورت نے شوہر اور ایک حقیقی بھائی کو چھوڑا تو نصف شوہر کا حق ہوگا اور نصف بھائی کا- اسی طرح اگر شوہر اور حقیقی بہن کو چھوڑا تو نصف شوہر کا حصہ ہوگا اور نصف حقیقی بہن کا، اگر اس نے شوہر اور حقیقی بھائی کے علاوہ ایک بیٹی کو بھی چھوڑا ہے، تو شوہر چوتھائی ترکہ کا اور بیٹی نصف ترکہ کی مستحق ہوگی، باقی بھائی کا ہوگا، اگر یہاں حقیقی بھائی کے بجائے حقیقی بہن ہوتو باقی اس کو ملے گا؛ بلکہ بعض دفعہ تو ایسا بھی ہوتا ہے کہ حقیقی بھائی اور ماں شریک بہن کا حصہ برابر ہوجاتا ہے، جیسے کسی عورت نے شوہر کو، ماں کو، ماں شریک بہن کو اور حقیقی بھائی کو چھوڑا ہوتو نصف ترکہ کا مستحق شوہر ہوگا، چھٹا حصہ ماں کو ملے گا، حقیقی بھائی اور اخیافی بہن دو چھٹے حصے کے حقدار ہوں گے؛ حالانکہ رشتہ کے اعتبار سے یہ بھائی اس بہن سے زیادہ قریب ہے۔

یہ چند مثالیں ہیں، ورنہ بہت سی ایسی صورتیں بنتی ہیں، جن میں عورت اپنے ہم درجہ مرد رشتہ دار سے زیادہ کی مستحق ہوتی ہے۔

مردوں سے زیادہ حصہ

بہت سی صورتوں میں عورتوں کا حصہ مردوں سے بڑھ جاتا ہے، چند صورتیں ذیل

میں نقل کی جاتی ہیں:

۱-اگر کسی عورت کا انتقال ہوا اور اس نے شوہر، باپ، ماں اور دو بیٹیوں کو چھوڑا اور بالفرض اس کا ترکہ ساٹھ لاکھ روپئے پر مشتمل ہو، تو دونوں بیٹیوں کو بتیس لاکھ روپئے یعنی فی کس سولہ لاکھ روپئے ملیں گے اور اگر اس نے شوہر، باپ، ماں کے علاوہ دو بیٹوں کو چھوڑا ہو تو وہ پچیس لاکھ یعنی فی کس ساڑھے بارہ لاکھ روپئے کے حقدار ہوں گے،- اسی طرح اگر کسی عورت کے ورثہ میں شوہر، ماں اور حقیقی بہنیں ہوں اور مثال کے طور پر اس کا ترکہ اڑتالیس لاکھ ہو تو دونوں بہنوں کو چوبیس یعنی فی کس بارہ لاکھ ملے گا، اور اسی صورت میں اگر دو بہنوں کے بجائے دو حقیقی بھائی ہوں، تو ان کا حصہ سولہ لاکھ یعنی فی کس آٹھ لاکھ ہوگا، ان صورتوں میں عورتوں کا مقررہ حصہ دو تہائی اس حصہ سے بڑھ جاتا ہے، جو مرد کو بطور عصبہ حاصل ہوتا ہے۔

۲-بعض صورتوں میں عورت نصف ترکہ کی مستحق ہوتی ہے، یہ اس کا مقررہ حصہ ہے، جب کہ اس کے ہم درجہ مرد کا حصہ کم بنتا ہے، جیسے ایک عورت نے شوہر، باپ، ماں اور ایک بیٹی کو چھوڑا ہو تو اگر ترکہ ایک کروڑ چھپن لاکھ روپئے پر مشتمل ہو تو بیٹی بہتر لاکھ کی مستحق ہوگی، اس صورت میں اگر بیٹی کی جگہ بیٹا ہو تو اس کا حصہ پینسٹھ لاکھ ہوگا-بعض دفعہ تو یہ فرق بہت زیادہ ہو جاتا ہے، جیسے کسی عورت کے ورثہ میں شوہر ہو، ماں ہو اور حقیقی بہن اور فرض کیجئے کہ مرحومہ کا ترکہ اڑتالیس لاکھ ہو، تو بہن کا حصہ اٹھارہ لاکھ ہوگا اور اس صورت میں اگر بہن کے بجائے بھائی ہو تو اس کا حصہ صرف آٹھ لاکھ ہوگا۔

۳-بعض دفعہ عورت کا مقررہ تہائی حصہ بھی اپنے مقابل مرد رشتہ دار سے زیادہ ہو جاتا ہے، مثلاً ایک شخص نے بیوی، ماں، دو حقیقی بھائی اور دو ماں شریک بہنوں کو چھوڑا اور

فرض کیجے کہ مرنے والے کا ترکہ اڑتالیس لاکھ روپئے تھا تو دونوں ماں شریک بہنوں کو سولہ یعنی فی کس آٹھ لاکھ روپئے ملیں گے اور دونوں حقیقی بھائیوں کا حصہ بارہ یعنی فی کس چھ لاکھ ہوگا،-اسی طرح اگر عورت نے شوہر، دو ماں شریک اور دو حقیقی بھائیوں کو چھوڑا ہو اور مثلاً اس کا ترکہ ساٹھ لاکھ روپئے ہو، تو دونوں بہنوں کا حصہ بیس لاکھ ہوگا اور دونوں بھائیوں کا دس لاکھ۔

۴-بعض دفعہ خواتین کا مقررہ حصہ ترکہ کا چھٹا حصہ ہوتا ہے؛ لیکن وہ اس کے مقابل مرد رشتہ دار سے بڑھ جاتا ہے، جیسے ماں شریک بہن کا مقررہ حصہ چھٹا حصہ ہے، اب اگر کسی عورت نے شوہر، ماں، ایک ماں شریک بہن اور دو حقیقی بھائیوں کو چھوڑا ہو، تو اگر ساٹھ لاکھ ترکہ ہو تو بہن کو دس لاکھ ملے گا اور دو بھائیوں کو بھی دس لاکھ یعنی فی کس پانچ لاکھ ملے گا۔

اس طرح کی اور بھی متعدد صورتیں ہیں۔

جب صرف عورت وارث بنتی ہے

بعض حالتیں ایسی ہیں کہ جن میں عورت وارث بنتی ہے، مرد وارث نہیں بنتا، جیسے

۱-ایک عورت نے شوہر، باپ، ماں، بیٹی اور پوتی کو چھوڑا ہو تو پوتی چھٹے حصے کی حقدار ہوگی؛ لیکن اسی صورت میں اگر پوتی کے بجائے پوتا ہو تو اس کو کچھ نہیں ملے گا۔

۲-اسی طرح اگر شوہر، حقیقی بہن اور باپ شریک بہن وارث ہوں تو باپ شریک بہن چھٹے حصہ کی مستحق ہے اور اگر اس کی جگہ باپ شریک بھائی ہو تو اس کو کچھ نہیں ملے گا۔

ان کے علاوہ بھی متعدد صورتیں ہیں، جن میں خواتین حصہ پاتی ہیں اور ان کے مقابل مرد رشتہ دار حصہ نہیں پاتے۔

خواتین کا کم حصہ کب اور کیوں؟

اس میں شبہ نہیں کہ جو لوگ لازمی طور پر میراث میں حصہ پاتے ہیں، یعنی باپ، ماں، بیٹا، بیٹی اور شوہر و بیوی، ان میں مردوں کا حق عورتوں سے زیادہ یا دوہرا رکھا گیا ہے؛ لیکن اس کو مردوں اور عورتوں کے درمیان جنس کی بنیاد پر تفریق نہیں سمجھنا چاہئے، یہ اس اصول پر مبنی ہے کہ جس کی ذمہ داریاں زیادہ ہوں گی، ان کے حقوق بھی زیادہ ہوں گے، اور جس کی ذمہ داری کم ہوگی، اس کے حقوق کم ہوں گے، اس اصول کو رسول اللہ ﷺ نے اپنے ایک ارشاد سے واضح فرمایا:

''**الخراج بالضمان**''(ابوداؤد: کتاب الاجارہ، باب فی من اشتری عبدا فاستعملہ، الخ حدیث نمبر:۳۵۰۸، ترمذی: عن عائشہؓ، حدیث نمبر:۱۲۸۵) اس کا ماحاصل یہ ہے کہ جو نقصان برداشت کرے گا، وہی فائدہ کا بھی حق دار ہوگا۔

اس پہلو سے اگر مردوں اور عورتوں کی مالی ذمہ داریوں کا موازنہ کیا جائے تو یہ بات اچھی طرح واضح ہوجائے گی، مرد پر اپنی کفالت خود واجب ہے، بیوی کی ضرورت کو پوری کرنا اس کی ذمہ داری ہے، اولاد کی پرورش اور اس کی تعلیم وتربیت کے تمام اخراجات، نیز ان کی شادی بیاہ مرد کے ذمہ ہے، یہاں تک کہ اگر بیوی شیر خوار بچہ کو دودھ پلانے پر آمادہ نہ ہو تو باپ کا فریضہ ہے کہ اس کے دودھ کا انتظام کرے، والدین نیز یتیم، غیر شادی شدہ بھائیوں، بیوہ اور مطلقہ بہنوں کی کفالت بھی اکثر حالات میں وہی کرتا ہے، اولاد اگر خدانخواستہ اس دنیا سے گذر جائے تو پوتوں اور پوتیوں کی پرورش اس کی ذمہ داری ہے، غرض کہ تمام مالی ذمہ داریاں مردوں پر رکھی گئی ہیں، عورتوں پر بہت کم اس ذمہ داری کا حصہ عائد ہوتا ہے، یہاں تک کہ وہ خود اپنی کفالت کی ذمہ داری سے بھی آزاد ہیں، اگر اس

پہلو سے دیکھا جائے تو بیٹا، بیٹی، باپ، ماں اور شوہر و بیوی کے حصہ میراث میں اس سے بھی زیادہ تفاوت ہونا چاہئے تھا؛ لیکن خواتین کی خلقی کمزوری کو سامنے رکھتے ہوئے اور ان کی رعایت کرتے ہوئے حصوں میں کم تفاوت رکھا گیا ہے۔

اس کو ایک اور طریقہ پر سمجھا جاسکتا ہے، شریعت میں والدین کی اہمیت وعظمت اولاد سے زیادہ ہے، اس کا تقاضا یہ تھا کہ والدین کا حصہ زیادہ ہو اور اولاد کا حصہ کم ہو؛ لیکن اس کے برخلاف ترکہ میں ماں باپ کا حصہ کم ہے اولاد کا زیادہ؛ کیونکہ ماں باپ اپنی ذمہ داریوں سے فارغ ہو رہے ہیں، ان کی ذمہ داریوں کی بساط لپیٹی جارہی ہے اور اولاد ذمہ داریوں کے میدان میں قدم رکھ رہی ہیں؛ اس لئے اولاد کا حصہ زیادہ رکھا گیا اور والدین کا کم، غرض کہ قانون میراث کا گہرا تعلق نفقہ اور کفالت کے قانون سے ہے، جن کی ذمہ داریاں زیادہ ہیں، ان کا حصہ بھی زیادہ ہے، اور جن کی ذمہ داریاں کم ہیں، ان کا حصہ بھی کم ہے، یہ ایسا منصفانہ اصول ہے جس کی معقولیت سے کوئی صاحب انصاف انکار نہیں کرسکتا۔

☆☆☆